پندرہ روزہ

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

بسم الله الرحمن الرحيم

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

الراحمون يرحمهم الرحمن ارحموا من في الارض يرحمكم من في السماء

(حديث صحيح)

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

"THOSE WHO ARE MERCIFUL HAVE MERCY SHOWN THEM BY THE COMPASSIONATE ONE IF YOU SHOW MERCY TO THOSE WHO ARE IN THE EARTH HE WHO IS IN HEAVEN WILL SHOW MERCY TO YOU." (*Sahih Hadith*)

Regd. No. 1 1981 FORTNIGHTLY Phone 22948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow (India)

عالمِ اسلام میں اجلاس ندوۃ العلماء کی صدائے بازگشت

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا خیر مقدم عالم اسلام میں گرمجوشی اور وسیع پیمانہ پر کیا گیا ہے، وہاں کے ممتاز علماء دین، اہل فکر، ماہرین تعلیم اور ارباب فضل وکمال نے بہت شوق سے اسکی دعوت کو قبول کیا اور اسکے بارہمیں اپنے گرانقدر خیالات اور جذبات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔

عالم اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی جامعہ ازہر کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے جامعہ ازہر کے ایک موقر وفد کیساتھ اسمیں شرکت کی دعوت قبول کی ہے۔ رابطۂ عالم اسلامی کا ایک وفد انشاء اللہ جشن میں شریک ہوگا، تیونس کی بارہ سو سالہ قدیم درسگاہ جامعہ زیتونیہ، فیڈریشن آف اسلامک یونیورسٹیز مراکش، وزارت تعلیم الجزائر، ادارہ امور مذہبی قطر، جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی کویت، دارالافتاء لبنان کے صدور، دمشق یونیورسٹی کے کئی ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ، شرق اردن کے دو سابق وزیر اوقاف، حرم شریف کے امور دینیہ کے نگران اعلیٰ نیز متعدد تعلیمی سرکاری محکموں اور تعلیم گاہوں کی طرف سے امید افزا جوابات موصول ہوئے ہیں، اور ان کے نمائندوں اور ذمہ داروں نے اس عالمی اجتماع میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ سعودی عرب کے پٹرولیم اور معدنی وسیلوں کے وزیر شیخ احمد زکی یمانی نے ناظم ندوۃ العلماء کو لکھا ہے کہ "مجھے سخت افسوس ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میرا پروگرام پہلے سے طے ہوچکا ہے اس لئے میں شرکت سے قاصر رہونگا تاہم میں آپ حضرات کی کامیابی اور توفیق وسعادت کے لئے دعاگو ہوں اور میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں"۔ —— سعودی عرب کے وزیر تعلیم جناب حسن عبداللہ آل الشیخ نے اجلاس میں شرکت منظور کی ہے، سعودی محکمہ افتاء اور ادارہ دعوت اسلامی کے ڈائرکٹر جنرل شیخ محمد ناصر العبودی نے بھی اپنی شرکت کی منظوری بھیجی ہے، سینغال افریقہ کے مشہور زعیم وشیخ الاسلام شیخ ابراہیم نیاس نے بھی دعوت منظور کی ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی اہم اور ممتاز شخصیتوں کے جوابات ہمیں موصول ہوئے ہیں جن سے ندوۃ العلماء کے بارے میں ان کے قابل قدر جذبات اور خیالات کا اندازہ ہوتا ہے، توقع ہے کہ انشاء اللہ عالم اسلام کے بہت منتخب اور چیدہ اشخاص اس میں شرکت فرمائینگے۔

اجلاس کی تیاریاں

اجلاس ندوۃ العلماء کی تیاریاں بدستور جاری ہیں، دفتر اجلاس کا رابطہ ملک اور بیرون ملک سے قائم ہے، عرب ممالک کے مختلف باثر دینی رسالوں اور اخباروں نے بہت اہتمام سے اور بعض روزناموں نے جلی سرخیوں کیساتھ اس کے انعقاد کی اطلاع شائع کی ہے، کویت کے مشہور رسالہ المجتمع، بیروت کے ہفت روزہ الشہاب، رابطہ عالم اسلامی کے ترجمان نیز مکہ مکرمہ اور جدہ کے روزناموں اور دیگر اخبارات وجرائد نے ندوۃ العلماء کے متعلق متعدد مضامین شائع کئے۔

ملک اور بیرون ملک میں فضلاء ندوۃ العلماء سے بھی برابر رابطہ قائم رکھا جارہا ہے تاکہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاسکے ــــ اجلاس میں منعقد ہونیوالی مجلس مذاکرہ کیلئے تعلیمی دینی موضوعات طے کئے جاچکے ہیں، اور ان پر علمی تحقیقات پیش کرنے کے لئے عالم اسلام کے منتخب وممتاز اہل علم کو دعوت دی گئی ہے۔

مقامی طور پر دارالعلوم کی چمن بندی اور تعمیر ومرمت کا کام انجام دیا جارہا ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک کا تعارف اور اس کی ایک مستقل تاریخ تیار کیجارہی ہے، نیز کتب خانہ ندوہ کے مخطوطات پر تعارفی کتاب اور فضلاء ندوہ کی گائیڈ بک بھی تیار ہورہی ہے ــــ اجلاس میں شرکت کیلئے ندوہ سے تعلق رکھنے والے نیز ملک کے منتخب حضرات کی فہرست تیار کیجارہی ہے ان کو باضابطہ دعوت نامے ارسال کئے جائیں گے، اجلاس میں شرکت صرف ان ہی لوگوں کے لئے رکھی گئی ہے جنکو باقاعدہ دعوت نامہ بھیجا جائے گا یا جن کو شرکت کا پاس دیا جائیگا، نظم وانتظام کے تقاضوں کے مطابق ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دیگر حضرات کو شریک اجلاس کرنا ذمہ داران اجلاس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

دفتر اجلاس ندوۃ العلماء

(اس شمارے کی قیمت ۵۰ پیسے ہے)
پندرہ روزہ
تعمیرِ حیات لکھنؤ
شمارہ نمبر ۲۰-۲۱
جلد نمبر ۱۲
سالانہ ۱۲ روپے
فی پرچہ ۵۰ پیسے
شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۵ اگست و ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۵ء — ۱۶ شعبان و ۳ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۵ھ

اسحاق جلیس ندوی

مصر و اسرائیل معاہدہ

قوموں کی زندگی میں بعض قیادتیں اپنے زمانۂ قیادت میں۔۔۔ دور اندیشی، تدبر، حقیقت پسندی اور جرأت و شجاعت کا ثبوت دیتی ہیں کہ انکا دور صدیوں تک اس قوم کے عروج و اقبال، اور ترقی و کامرانی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض قائدین کا ناعاقبت اندیشی، غیر مخلصانہ عمل اور بزدلی و کم ہمتی صدیوں تک ان کی قوم پر زوال و ادبار کا سایہ ڈال دیتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں ان شخصیتوں کی کمی نہیں جن کا تنہا عمل قوم کے لئے عذاب یا نجات ثابت ہوا ہے۔

کسی قوم کا عروج و زوال صدیوں کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، قومی زندگی میں چند دن یا چند برس کسی بہتر یا غلط انجام کے لئے کافی نہیں۔ اٹھارویں صدی کے بعد یوروپین اقوام کا عروج، ان کی نشأۃ ثانیہ، وہاں کا صنعتی انقلاب۔ ریفارمیشن موومنٹ، اپنے ملک سے نکل کر ان کا دنیا کے دوسرے خطوں اور اپنے براعظم سے نکل کر دوسرے براعظموں پر کمندیں ڈالنا اور نوآبادیاتی نظام پھیلانا، دنیا کی اکثریت کو۔۔۔ طوقِ غلامی پہنانا یہ ایک شب یا دو دن کا عمل نہیں ہے۔ اس کے پس پشت برسوں کی پلاننگ اور جد و جہد اور صدیوں کی محنت و کوشش ہے۔

صلیبی جنگوں کے مفتوح، اور قسطنطنیہ کے شکست خوردہ ان ناکامیوں سے نئی کامیابیوں کا جذبہ، منصوبہ اور عزم لے کر دیوانہ وار کوششوں میں لگ گئے۔ یورپ میں اگر کوئی ایسی قیادت ہوتی جو شکست و ناکامی کے بعد اس پر صبر و قناعت کی تلقین کرتی تو شاید دنیا کی تاریخ اور مغرب کی کتابِ زندگی کا وہ باب شروع نہ ہوتا جو مشرق کے لئے تازیانۂ عبرت اور مغربی اقوام کے لئے حیاتِ نو تھا۔

مغربی قیادت نے جنگ صلیبی کی ناکامی کے نقشے میں اپنے عروج و کامیابی کا رنگ بھرا اور وہ ایک صدی کے اندر دنیا پر چھا گئی۔

اقوام و ملل کی تاریخ میں ایسے بےشمار واقعات ملتے ہیں کہ ایک قائد کی غلطی کا خمیازہ پوری قوم کو صدیوں تک بھگتنا پڑا۔

قیادت کی وہ غلطی ہی تھی جس نے لارنس آف عربیا کو اپنا خیرخواہ سمجھ کر ارض مقدس میں صیہونی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی، قیادت کی نااہلی، بےبصیرتی، افتراق و انتشار تھا جس نے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء میں اسرائیل کو اپنے حدود کی توسیع کے مواقع فراہم کئے۔

اور قیادت کی وہ بھیانک غلطی تھی جس نے جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کو اتنا بڑھنے کا موقع دیا کہ اس کی چیرہ دستی کی زد میں قاہرہ، بیروت، دمشق، عمان حتی کہ حرمین شریفین تک آگئے۔ فلسطین کے کاز سے اس قیادت کو صرف اس حد تک دلچسپی تھی جتنی اپنی لیڈری کی چمک اور اسٹیج و ڈائس پر اداکاری کے لئے ناگزیر ہو۔ اس قیادت نے کبھی سنجیدگی سے اس مسئلہ کو میدان جنگ یا گفتگو کی میز پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شمشیر و سنان اور زبان و قلم دونوں میں سے کسی ایک سے بھی صحیح کام عین وقت پر نہیں لیا گیا۔ فلسطین کے مظلوم اسرائیل اور عرب لیڈرشپ کے درمیان فٹ بال بنے رہے، ربع صدی سے زیادہ عرصہ گذرا کہ وہ جھونپڑیوں اور خیموں میں جانوروں سے بدتر زندگی گذارتے رہے ہیں اور ان کا مسئلہ عرب لیڈرشپ کی دکان چمکانے کا بہت بڑا وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔

جب ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء میں اسرائیل سے معرکہ آرائی کے دوران عرب ممالک باہمی افتراق اور نااہل لیڈرشپ کی وجہ سے ہزیمت سے دوچار ہوئے اور امریکہ کی سرپرستی میں صیہونی حکومت اپنی توسیع پسندانہ عزم و جذبہ کے ساتھ برابر ترقی کرتی رہی، تو اسی زمانہ میں بعض حقیقت پسند حلقوں نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ اسرائیل سے بات چیت کر کے فلسطینی عوام کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت لے کر اس کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس تجویز کو سنجیدگی یا بزدلی پر محمول کرنے کے بجائے سنجیدگی سے غور کیا جاتا تو شکست و ہزیمت، عرب سرزمین کے ہزاروں مربع میل علاقے، بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، گولان کی پہاڑیاں، صحرائے سینا ان سب سے ہاتھ نہ دھونا پڑتا مگر عرب دنیا کی "ناصری لیڈرشپ" (جس کا واحد نمائندہ مصر کا ایک آمر تھا) نے اس تجویز کے خلاف وہ طوفان برپا کیا کہ گویا یہ تجویز اپنی موت کے محضر پر دستخط کرنے کے مرادف ہے۔ جوش و جذبات کے گرد و غبار سے نکل کر حقیقت و واقعات کی صاف اور کھلی فضا میں اس پہلو پر غور کیا جاتا تو شاید آج کا روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ حالی یہ ہے کہ عرب ممالک اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ وہ جون ۱۹۶۷ء کی سرحد پر واپس چلا جائے مگر اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں جاری ہیں۔ وہ اپنے وجود کے تسلیم کی قیمت یا رعایت میں وہ علاقہ بھی چھوڑنے پر تیار نہیں جس پر اس نے آج کی دنیا میں یو این او کی موجودگی میں جارحیت کے ذریعہ قبضہ کیا تھا۔

اسرائیل کو سمندر میں ڈھکیل دینے والی قیادت نے نہ جرأت رندانہ کا ثبوت دیا نہ معاملہ فہمی اور حکمت و تدبر کا — مصر و اسرائیل کے درمیان ہونے والا عارضی معاہدہ ریت پر دیوار اور عرب کاز کے سلسلے میں ایک بامعنی بلکہ مضر اقدام ہے — اسرائیل عربوں سے بےشمار رعایتوں کا طالب ہے اور اس سودے بازی کا نفع عربوں کو چند غیر اہم علاقوں کی بازیابی کی شکل میں ملنے والا ہے۔

عرب اسرائیل مسئلہ میں سب سے اولین اہمیت بیت المقدس اور قبلۂ اول کو دینی چاہیے تھی اس کا ان دنوں ذکر تک نہیں ہے۔ گولان کی پہاڑیاں جو شام و لبنان کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہیں ان کے متعلق اسرائیل کوئی لچک دکھانے تیار نہیں۔ عرب مقبوضہ علاقے میں وہ نئی بستیاں اس لئے نہیں بنا رہا ہے کہ وہ انہیں چاندی کی کشتی میں سجا کر عربوں کو پیش کرے۔ حبرون کا الخلیل میں سیدنا ابراہیم اور یروشلم کی قدیم آبادی کی ہیئت بدلنے کی اسکیموں پر تیزی سے عمل جاری ہے۔ ان واقعات کی موجودگی میں یقین دہانی کی کیا حقیقت ہے کہ مصر و اسرائیل کا معاہدہ تمام عرب مقبوضہ علاقوں کی بازیابی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ اس خوش فہمی یا غلط فہمی میں وہی لوگ مبتلا ہو سکتے ہیں جو صیہونی توسیع پسندی، یہودی مزاج اور بڑی طاقتوں کی سازشوں سے ناواقف ہوں۔

ایک قائد کی غلط اندیشی اور ایک آمر کی آمریت کا خمیازہ عالم عربی کو نہ جانے کب تک بھگتنا پڑے — مصر و اسرائیل کے درمیان معاہدہ کی تفصیلات ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں مگر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ اس بدنصیب قوم اور اس کی موجودہ قیادت کا مجبورانہ عمل ہے جسے اس کی ماضی کی شدید شکست و رسوائی کی تنگ و تاریک گلی میں پہنچا دیا تھا، آج بھی طیب اور کاٹوں کی مثال کا اطلاق عرب دنیا پر جاری ہے، ماضی کی قیادت کی پیداوار ہے — اس معاہدہ میں عبرت و بصیرت کے وہ پہلو بھی ہیں جو قائدانہ غلطی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں تو دنیا میں دور تک ان کے اثرات جاتے ہیں جو صلیبی طلبہ کی شکست و ریخت کے ساتھ اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک دینی درسگاہ ہے جہاں طلبہ کو اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ موجودہ ضرورت کے ماتحت عربی و انگریزی ادب، قدیم و جدید علوم کی مناسب تعلیم دی جاتی ہے، تاکہ ہماری نئی نسل دین کی منزل تک پہونچنے میں دنیا کی رہگذر کو بھی عزت کے ساتھ طے کرے اور دوسروں کیلئے مشعلِ ہدایت اور نمونۂ تقلید بنے۔

اس درسگاہ کا سالانہ بجٹ ساٹھ لاکھ روپئے ہے۔ طلباء میں اکثریت ان غیر مستطیع طلباء کی ہے جن کے قیام، طعام اور تعلیم کا مفت انتظام کرنا پڑتا ہے، اسکے علاوہ مختلف ضروری تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مسجد کی توسیع اور چار دیواری کا کام تیز رفتاری سے جاری ہے، دفاتر کی عمارتوں اور طلبہ کے لئے ایک ہوسٹل کی تعمیر کا کام جلد شروع ہونے والا ہے۔ اجلاس ندوہ سے پہلے ان کی تعمیر ضروری ہے اور مصارف کا تخمینہ ۱۵ لاکھ روپئے ہے۔

اگر آپ

ایسے تعلیمی ادارے اور اس قسم کی تربیت گاہ کو مسلمانوں کے لئے مفید و ضروری سمجھتے ہوں اور دارالعلوم کی ان خدمات سے جو ندوی حضرات کی صورت میں جلوہ گر ہیں، مطمئن ہوں تو ہمیں حق پہونچتا ہے کہ ہم آپ سے مطالبہ کریں کہ حسب حیثیت اپنی گاڑھی کمائی کا تھوڑا سا حصہ اس ادارے کے لئے بھی نذر کریں اور اپنے بجٹ میں ترقی تعلیم و بہتری تربیت کی ایک مد قائم کر دیں۔

اس تجویز کو عمل میں لانے کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ آپ ہر ماہ اس رقم کو بذریعہ منی آرڈر یا بصورت ڈرافٹ ناظم صاحب ندوۃ العلماء، بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر بھیج دیجئے۔

اُن تمام حضرات کی خدمت میں، جو

سالانہ سو روپے یا ماہانہ دس روپے دیں گے تعمیر حیات بلامعاوضہ بھیجا جائے گا، تاکہ ان کو معلوم ہوتا رہے کہ ان کی رقم کس کام پر صرف کی جا رہی ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

(کارکنانِ ندوۃ العلماء)

بزرگِ محترم سیّد رشید احمد حسنی کی وفات

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خالہ زاد بھائی اور برادر نسبتی سید رشید احمد حسنی ۱۴ شعبان ۱۳۹۸ھ کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید رشید احمد حضرت شاہ علم اللہؒ کی اولاد میں ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، مولانا سید الحسنیؒ (جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے ماموں زاد بھائی اور مرید تھے) کے پر پوتے اور مولوی رشید الدین کے پوتے تھے۔

پیدائش ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء مولوی سید خلیل الدین احمد آنریری مجسٹریٹ کے صاحبزادے تھے، مولوی سید خلیل الدین احمد مولانا سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء کے چچا زاد بھائی اور مولانا سید فخرالدین خیالی کے بھانجے اور حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ مولوی سید خلیل الدین احمد ۱۳۱۲ھ میں گنگوہ جاکر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے۔

سید رشید احمد صاحب کا نام مولانا گنگوہیؒ کے نام پر رکھا۔ سید رشید احمد پیدائشی طور پر قوت سماعت اور قوت گویائی سے محروم تھے لیکن والد ماجد نے ان کے لئے ایک مستقل استاد رکھا جس نے ان کو اردو، انگریزی اور قرآن شریف کی تعلیم دی، ابتدائی تعلیم دینے میں مولانا فخرالدین خیالی نے بھی اہتمام کیا اور خود ان کو پڑھایا۔ ۱۵ سال کی عمر تھی کہ حضرت شاہ ضیاء النبی جو ان کے حقیقی نانا بھی تھے اور دادا کے حقیقی بھائی بھی نیز مولانا فخرالدین خیالی کا انتقال ہوگیا۔ بچپن ہی میں والدہ صاحبہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ اپنے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی جو اپنے والد کی پرورش میں رہے۔ ۲۲ سال کی عمر میں شادی مولانا حکیم سید عبدالحی کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی اور وہ زیادہ تر لکھنؤ میں رہنے لگے۔ علمی مجلسوں اور بڑے لوگوں کی صحبتوں نے ان کے دل و دماغ میں روشن خیالی بھر دی وہ علم آشنا، باخدا، دنیاوی وجاہت بھی رکھتے تھے اور علم و دین کی دولت بھی اس لئے وہ گوناگوں خصوصیات کے مالک تھے۔

نماز باجماعت کے بڑے پابند، قرآن شریف کی تلاوت اکثر کرتے، مسجد کی خدمت کا اہتمام کرتے، نماز کے بعد کی تسبیحات زبان سے ادا کرتے، جماعت شروع ہونے سے بہت پہلے مسجد پہونچ جاتے اور اپنے عزیزوں دوستوں کو اٹھاتے جاتے اور ساتھ لیتے مسجد جاتے۔ بڑھاپے میں جب قویٰ مضمحل ہوگئے تھے اندھیری راتوں کو مسجد جاتے اور کہتے کہ نماز باجماعت کے لئے تکلیف اٹھا کر جانا بڑے ثواب کی بات ہے۔

اولاد کی نماز میں تساہلی نہ برداشت کرتے اور سخت تنبیہ کرتے۔

امیروں غریبوں سے یکساں تعلق رکھتے۔ بڑے مہمان نواز تھے دسترخوان پر ایک ایک مہمان پر نظر رکھتے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت تھے اور ذکر و تسبیح کا اہتمام کرتے۔

حضرت مولانا زکریا شیخ الحدیث، مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد یوسفؒ کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوئے۔

دینی جلسوں میں ضرور جاتے اگرچہ نہ سن سکتے نہ بول سکتے۔ مگر صرف شرکت کرنا ثواب جانتے اور آخر تک شریک رہتے جو لوگ ان سے بات کرتے تو اشارے سے کرتے یا کسی کاغذ پر لکھ کر پوچھتے وہ لکھ کر جواب دیتے۔

انتظامی قابلیت بہت تھی والد کے انتقال کے بعد جائداد کا انتظام خوب کیا۔ جائداد بڑھائی اور گھٹائی نہیں باغ لگوائے اور آخر تک ان کا شوق رکھا۔

آخر عمر میں حج کی توفیق ہوئی اپنے منجھلے بیٹے مولانا محمد رابع کی معیت میں حج کیا دوبارہ حج کرنے کا ارادہ تھا اسی ارادہ کو لے کر خدا سے جا ملے۔

بڑے تیز، تیر انداز شکاری تھے آخر آخر تک پھول کھلتے رہتے، بڑے خوش طبع ہنس مکھ اور پرمزاح تھے، کچھ سمجھاتے یا کسی کا ذکر کرتے تو مثالوں سے اور اشاروں سے نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے جو ان سے ملتا ان کے اخلاق، باتوں اور خوش طبعی سے متاثر ہو کر رہتا، خدا نے دو نعمتیں لے کر (سماعت و گویائی) بے شمار احسان عطا فرمائے۔

آخر عمر ۱۳۹۶ھ میں موتیابن کا آپریشن کرایا اس کے بعد استعمال آنکھیں اور عینک بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ بدن میں درد، ٹانگوں میں کمزوری ہوئی اور چہار شنبہ ۲۴ رجب علیل ہو گئے، مولانا کی نشست پر سید صاحب فراش ہو گئے اور سخت علیل ہو گئے، زبان پر کلمہ برابر جاری رہتا، تسبیح پر درود شریف استغفار بکثرت پڑھتے، کہتے تھے کہ دل میں گنتی سو پڑھ لیتا ہوں۔ نماز کا ایسا اہتمام تھا کہ شروع بیماری میں جب کو سائیکل پر مسجد جاتے پھر ان

بھی معذور ہوئے اور آخر وقت تک نماز کا اہتمام کیا بعض بعض دفعہ ایک وقت کی نماز کئی کئی بار پڑھی سخت تکلیف کے باوجود نماز کا تقاضا کرتے اور تیمم کرتے اور دیر تک نماز پڑھتے رہتے، خدا کا خوف بہت تھا آخرت کے حالات معلوم کرتے رہتے اور جنت کے ذکر پر خوشی کا اظہار کرتے جنت کا ذکر کرتے رہتے اور دوزخ سے پناہ مانگتے۔

۱۳۹۴ھ میں جوان بیٹے سید محمود الحسن کا ۲۱ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا اسکے بعد زندگی میں نمایاں فرق ہو گیا ان کا اکثر ذکر کرتے اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے۔

اور جنت کی زندگی جنت والوں سے ملاقات کا ذکر تفصیل سے سنتے۔

دین کی کتابیں خود پڑھتے اور پوچھتے کیا لکھا ہے۔

۱۳ اگست ۱۹۷۸ء کو ۱۰ بجے دن انتقال ہوا، انتقال سے پہلے،

> اپنے بڑے لڑکے مولانا سید محمد ثانی مدیر ماہنامہ "رضوان" کو بہت سی وصیتیں کیں اور نیک زندگی گذارتے رہنے کی تلقین کی، غریبوں سے حسن سلوک، عزیزوں اور بھائیوں سے صلہ رحمی کا حکم دیا۔ انتقال سے دو روز قبل کہا گواہ رہو کہ مجھے اللہ اور اسکے رسول سے محبت ہے، اور میں غریبوں سے محبت رکھتا ہوں۔

آخر میں وہ زندگی سے مایوس ہو گئے تھے اور خدا کی طرف پوری طرح رجحان ہو گیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے غایت درجہ محبت تھی، ڈاکٹر سید عبدالعلی جو ہم عمر بھی تھے اور بے تکلف دوست بھی دونوں کو ایک دوسرے سے بہت تعلق تھا، ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد وہ اپنے کو بیکس و تنہا سمجھنے لگے تھے اور برابر ان کا ذکر کرتے۔

انتقال کے وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برابر قریب رہے اور قرآن کی تلاوت کرتے رہے۔ ۱۰ بجے انتقال ہوا ۴ بجے شام کو اپنے والد اور بیٹے کے درمیان مدفون ہوئے۔ جنازے میں بکثرت لوگ شریک ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا، اساتذہ اور اکابر اور دوسرے اہل علم نے شرکت کی مولانا ابوالحسن علی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی ۸۶ سال کی عمر پائی۔

تعزیت میں مختلف شہروں کے علماء، وفضلاء اور تعلق رکھنے والے آئے جن میں مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری، مولانا قاری مبین صاحب خلیفہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ اور ان کی جماعت قابل ذکر ہیں۔

ان کے تین صاحبزادے ہیں (۱) مولانا محمد ثانی حسنی مدیر ماہنامہ "رضوان" (۲) مولانا محمد رابع حسنی ندوی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء، (۳) مولانا محمد واضح رشید ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

زیر نظر شمارہ دو شماروں پر مشتمل
قیمت: ۷۵ پیسے

ایک اہم اعلان!

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ اجلاس میں داخلہ دعوت نامے یا پاس کے ذریعہ ہوگا — غیر مدعو حضرات کے قیام اور طعام کے نظم سے ہم معذور ہوں گے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائے ہوئے وہ حضرات جنہوں نے ابتک اپنے نام پتہ، اور مشاغل کی تفصیلات سے دفتر اجلاس کو مطلع نہیں کیا وہ جلد از جلد ان تفصیلات سے آگاہ کریں تاکہ ان کے نام دعوت نامہ بھیجا جا سکے۔

وہ پھول جس کی خوشبو سے انسانیت معطّر ہو جاتی ہے۔

مولانا قاری ودود الحق صاحب ندوی

اسلام کی اصطلاح میں رسول اس پاک مقدس انسان کو کہتے ہیں جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے احکامات دوسرے بندوں تک پہنچانے کے لئے خود منتخب فرماتا ہے، یہ شرف و عزت کسی کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ صرف خدا کی دین ہے اور محض اس کے فضل پر منحصر ہے، لہٰذا رسول کوئی اعزازی لقب یا امتیازی خطاب نہیں بلکہ یہ ایک اہم ذمہ داری ہے جس کا حامل ہر حال میں خدا کا متبع اور فرمانبردار ہوتا ہے جس کا کام سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ دنیا میں خدا کی مرضی اور اس کی فرمانبرداری کا ایک بے مثال نمونہ پیش کرے اور اس کا پیغام بندوں تک پہنچاتا رہے، رسول کھاتا بھی ہے، پیتا بھی ہے، سوتا بھی ہے، جاگتا بھی ہے، ہنستا بھی ہے، روتا بھی ہے، وہ نکاح بھی کرتا ہے اور صاحب اولاد بھی ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ رسول بھی زندگی کے اس مرحلے سے گزرتا ہے جس کو عرف عام میں موت کہتے ہیں، غرض وہ بر حقیقت سے اللہ کا ایک منتخب بندہ اور اس کا ایک مقدس ایلچی ہوتا ہے وہ کسی اعتبار سے نہ تو خدا ہوتا ہے نہ خدا جیسا ہوتا ہے اور نہ اس میں صفات خداوندی جیسی صفتیں ہوتی ہیں۔

آپ فرمائیں گے رسول پھول ہے یا خوشبو، چراغ ہے یا روشنی، صبح حیات ہے یا شام وصال، ہادی ہے یا مجسمۂ ہدایت و نور۔۔؟

دوستو! وہ ان شاعرانہ تعبیرات سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتا، مالک ذوالجلال والاکرام اپنے تقرب و تکلم کا جو شرف اسے عنایت فرماتا ہے اور اپنی نمائندگی کی جو جلیل القدر عزت اسے مرحمت فرماتا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا شاید برمحل ہو کہ رسول درحقیقت گلستان سرمدی کا نہ مرجھانے والا ایک پھول ہوتا ہے جس کی خوشبو سے انسانیت معطر ہو جاتی ہے۔ شرق و غرب کی حد بندیوں سے بالکل آزاد وہ آفتاب رحمت ہوتا ہے جو فلک ہدایت کے نصف النہار پر ہر وقت ضیا پاشیاں کرتا رہتا ہے، تیرہ بختوں کے لئے وہ روز سعید ہوتا ہے جس کے رات و دن اپنی برکتوں کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں وہ اللہ کی حجت اور انوار و تجلیات کا عظیم الشان خزانہ ہوتا ہے، جس کے در کی بھیک سے تیرہ و تار انسانیت سر سے پیر تک جگمگا اٹھتی ہے۔

اب آپ دریافت فرمائیں گے کہ وہ کب آتا ہے اور اس کے آمد گرامی کی کیا شان ہوتی ہے؟

تو اس سوال کو روزمرہ کی مثال میں یوں سمجھئے، جس زمین کا سینہ آفتاب کی تمازت سے سلگنے لگتا ہے، جب اس کی زندگی کی تمام تازگیاں اور شادابیاں خزاں کے ہاتھوں پامال ہو جاتی ہیں جب اس کی رونقوں کو باد سموم کی نظر لگ جاتی ہے اور اس کی دلفریبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہو جاتی ہیں تو قدرت کو اس کی بے رونقی پر ترس آجاتا ہے اس وقت اس کے کرم کا اشارہ پاکر جھومتی ہوئی بدلیاں افق آسمان سے جھانکنا شروع کردیتی ہیں جن کو نسیم بہاری اپنے نرم و نازک کاندھوں پر سوار کرکے اس بے بضاعت و بے برگ و بار زمین کا مونس و غمخوار بنادیتی ہے، یہ بدلیاں زندگی بن کر اس میں اتر پڑتی ہیں اس طرح زمین کی رعنائیاں اور شادابیاں پھر سے عود کر آتی ہیں اور اس کی ساری ویرانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح بغاوتوں اور گناہوں کی جاں سوز حدت سے جب روح انسانی میں خزاں آتی ہے جب وہ آخری سانس کے لئے اپنا منہ کھول دیتی ہے، جب اس کی آنکھیں بے نور اور اس کا نورانی چہرہ بے رونق ہونے لگتا ہے جب اسکے ربانی فیضان ختم ہونے لگتے ہیں اور اس کی برکتیں ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگتی ہیں تو اس وقت غیر شعوری طور پر اس کی فطرت روتی ہے اور قدرت کے رحم و کرم کو اپنے معصوم آنسوؤں کی روانی پر بہا لاتی ہے۔

اللہ کی یہ رحمت رسول اور پیغمبر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ رسول ایک انسان ہوتا ہے مالک کا ایک فرمانبردار بندہ ہوتا ہے اور اپنے عہد میں تمام بندوں میں سب سے زیادہ اللہ کا محبوب اور دلارا ہوتا ہے جس کو قدرت بیمار انسانیت کے علاج و تیمارداری کے لئے خود منتخب کرتی ہے اور جس کے ہاتھوں مرتی ہوئی روح کے حلقوم میں زندگی کا پانی ٹپکاتی ہے۔

حضرات! انسان اپنی صحت مند شاہراہ کی تخلیق میں مختلف دوروں سے گزرتا رہا ہے اور تہذیب و تمدن و حضارت کی تعمیر میں اس نے ہزاروں ٹھوکریں کھائی ہیں، وہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اور منزل حیات کے ہر چوراستہ پر جب بھٹک کر رہ گیا ہے تو نشان منزل کے لئے اس تھکے مسافر نے کسی راہنما کو آواز دینی شروع کی ہے اور اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بھی اس بھٹکے ہوئے مسافر پر راہیں بند ہو گئی ہیں اور نشان منزل گم ہو چکا ہے تو فیاض عالم نے اس کی دستگیری بھی فرمائی اس نے اپنی طرف سے کسی راہنما کو بھیجا جس نے اس کی انگلی پکڑ کر راستہ پر لگا دیا، یہ راہنما کتنے آئے اور کب کب آئے اس کا صحیح علم ان کے بھیجنے والے کو ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ اس کے کرم و عنایت سے زمین کا کوئی گوشہ خالی نہ بچا۔ ہم ان تمام رہنماؤں اور رہبروں کی دل سے عزت کرتے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں گم کردہ راہ انسانوں کی دستگیری فرمائی۔ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم۔

دوستو! انسان اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اور ایک عرصہ دراز تک راہ نوردی کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں پگڈنڈیاں ختم ہو کر زندگی کی ایک عظیم الشان شاہراہ شروع ہو رہی تھی یہ وہ دور تھا جب کہ انسان قومیت و وطنوں کے اس مرحلہ میں قدم رکھ رہا تھا جہاں ملکی مغایرت اور جغرافیائی اجنبیت ختم ہو چکی تھی، یہ انسان کے بین الاقوامی دور کا آغاز تھا اس وقت مشرق و مغرب ایک دوسرے کی نگاہوں میں اجنبی اور غیر معروف نہ رہے تھے آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ابتدائی خطوط ابھر چکے تھے۔

انسان جب اس مقام پر پہونچا تو اس کا دم پہلے سے بھی زیادہ گھٹنے لگا، اور اس کی روح پہلے سے زیادہ بے چین ہو گئی اب اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں اس کا قافلہ چند نفوس پر مشتمل نہ رہا تھا بلکہ وہ ایک اتھاہ سمندر بن چکا تھا جس کو بیمار معاشرے کی تنگ راہیں آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں جو بے رنگی اور یکسانیت کے باوجود اس کو مختلف سمتوں میں بکھیرتی ڈھکیل رہی تھیں۔ یہ تمام چشمے کسی ایک سمندر میں جمع ہونے کے لئے بیقرار تھے، لیکن راستے کی ٹیکریاں "اور پہاڑیاں" مزاحمت کر رہی تھیں، "صحرا" اور "ریگستان" اس کو پی لینا چاہتے تھے، "ہوائیں" اس کو اڑالے جانا چاہتی تھیں، "تمازتیں" اپنی نگاہوں سے اس کو چوس لینے پر آمادہ تھیں۔ اس عالم اضطراب میں اس نے پھر اپنے مالک کو پکارا، اس مرتبہ کی فریاد پچھلے کی تمام فریادوں سے بڑھی ہوئی تھی اب یہ ایک دو آوازیں نہ تھیں بلکہ بے شمار بے چین آوازوں کی مرتعش لہریں تھیں جو ایک فریاد کی شکل میں عرش والے تک پہونچکر رحم و کرم کی بھیک مانگ رہی تھیں، ارحم الراحمین کو رحم آیا اور اس نے ایک مرتبہ طلب کے مطابق وہ ابر کرم بھیجا جس نے اپنی آغوش میں سارے عالم کو لے لیا اور اس طرح موسلا دھار برسا کہ جل تھل ہو گئے، راستہ کے تمام موانع سیل رحمت کی تاب نہ لاکر بہہ گئے اور ہر چشمہ اتنا اونچا ہو کر بہنے لگا کہ راستہ کا کوئی مزاحم ٹک نہ سکا اور بالآخر یہ تمام چشمے ایک پاکیزہ اور شفاف سمندر کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

محترم سامعین! یہ وہی ابر کرم ہے جس کو رحمۃ للعالمین کے نام سے دنیا جانتی ہے اور جس کو عرش والے محبوب رب المشرقین والمغربین کے نام سے پہچانتے ہیں، یہی ہے پروردگار کا سب سے آخری نبی، یہی ہے انسانی رفعتوں اور بلندیوں کا سب سے بڑا افتخار، یہی ہے وہ مقدس پیامی جس نے مکہ کی خوش قسمت پہاڑی "صفا" کی چوٹیوں پر چڑھتے ہوئے خستہ حال انسانیت کو ابدی رفعتوں کی طرف بلایا اور یہی ہے آدم کے قبیلہ کا سب سے بڑا محسن جس نے ان کی چھنی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ اس وقت واپس دلایا، جب "کوہ زیتون" و "سعیر" کی پہاڑیوں کی بابرکت آوازیں خاموش فضاؤں کی مقدس امانتیں بن چکی تھیں اور صحف سابقہ کے تمام مواعظ و نصائح یکسر معدوم ہو چکے تھے صلی اللہ علیہ وسلم۔

اللہ کے اس منادی نے بھٹکی ہوئی دنیا کو آواز دی اور بار بار آواز دی پہلے تو اس نے غفلت برتی، انکار کیا، پوری شدت سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی لیکن بالآخر وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ گرتی پڑتی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی، یہاں چشم زدن میں اس کے سارے بوجھ اس سے بہت دور پڑے ہوئے تھے اور اب یہ ہر قید و بند سے آزاد ہو چکی تھی۔

بقول حالی مرحوم ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

نفس مطمئنہ کی حامل ایک بزرگ ہستی جو ہم سے جدا ہوگئی

مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

○

کل اچانک یہ خبر سنی کہ جناب سید رشید احمد صاحب کی وفات ہوگئی، دل کو ایک برگزیدہ ہستی کے دنیا سے چلے جانے کا رنج ہوا، دعائے مغفرت کی توفیق ہوئی اور جانے والے کی معلوم خوبیاں ایک ایک کرکے دل و دماغ میں گھومنے لگیں۔ دیر تک انہیں خیالات کا ہجوم رہا۔ مرحوم کے اوصاف کا پہلے مجھ سطور تحریر یہ دل میں ذکر و تعارف ہوچکا ہے اور اب بھی غالباً ان کے قریبی جاننے والے ان کے متعلق تفصیل سے لکھیں گے میں نہ مرحوم سے تفصیلی واقفیت رکھتا ہوں اور نہ اُن کو نزدیک سے بہت زیادہ دیکھنے کا موقع ہی مجھ کو مل سکا۔ فقط چند بار ان کی زیارت کی سعادت حصہ میں آئی اور ہر بار آنکھوں نے جو دیکھا اور دل نے جو اثر لیا بس اسی کو اپنے سادہ الفاظ و عبارت میں بیان کردینا چاہتا ہوں۔ توقع ہے کہ انشاء اللہ ان کا تذکرہ بہت سے ناظرین کے لئے مفید ہوگا۔

مرحوم کی زیارت اور اُن سے میری ملاقات کی اول و آخر تاریخ یہ ہے کہ ہوش کی آنکھ کھولنے کے بعد جب میں نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی سب سے پہلی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ کا مطالعہ کیا تو مجھے اُس مقام کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہوا، جہاں پر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت مجاہدین اسلام کی ایک مثالی جماعت تیار ہوئی تھی اور وہاں سے احیاء دین و ملت کی خاطر سر پر کفن باندھ کر وطن سے اس طرح نکل گئی تھی کہ پھر کبھی واپس نہ آئی پھر وہ وقت جلد ہی آگیا کہ میرا شوق مجھ کو ضلع رائے بریلی کے اس تاریخی اور روحانی مقام پر لے گیا وہاں میری آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا اور دل نے بہت کچھ محسوس کیا لیکن جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا اور جس کا دل پر خصوصی اثر پڑا وہ ایک بزرگ کی زیارت و ملاقات تھی میں ابھی محترم مولانا علی میاں صاحب کے مکان سے کچھ دور کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی ہی پر تھا کہ میں نے دیکھا کہ مولانا کی بیٹھک کے چبوترے پر بچھی چارپائی پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ مجھے آتا دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور ابھی میں فاصلہ ہی پر تھا کہ انہوں نے پُر شفقت اور مسکراتے ہوئے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے گرم جوش اشاروں کے ساتھ میرا استقبال کیا، میں نے ان کو سلام عرض کیا تو انہوں نے زبان سے سلام کا جواب نہیں دیا بلکہ جواب میں بھی ہاتھ ہی کے اشارہ سے کام لیا، چونکہ میں جانتا تھا کہ اس مقام کو محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور اسی لئے یہاں دینی عظمت اور دنیاوی وجاہت رکھنے والے لوگ ہمیشہ بڑی تعداد میں آیا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ ایسا مقام جہاں معزز و منصب پر فائز لوگ زائرین اور مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہو،

وہاں ہر ہر نووارد کے لئے گرم جوشی کے ساتھ استقبال اور اس کے ساتھ خصوصیت برتنے کا ماحول نہیں رہا کرتا اور اسمیں میزبان حضرات بڑی حد تک معذور بھی خیال کئے جاسکتے ہیں، اس لئے جب میں نے اپنے جیسے ایک بے حیثیت، گم نام اور کم عمر نووارد کے ساتھ استقبال کا خصوصی مظاہرہ دیکھا تو مجھ کو بڑا تعجب ہوا، اور یہ بات بھی تعجب کا باعث تھی کہ یہ بزرگ میری آمد پر مسرت کا اظہار تو اس گرم جوشی کے ساتھ فرما رہے تھے، لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں فرماتے تھے حتی کہ سلام کے جواب میں بھی بس ہاتھ کے اشارہ ہی پر اکتفا فرمایا تھا میں ان کے قریب پہونچا تو انہوں نے خود ہی پیش قدمی فرماکر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے اور میرے کچھ پوچھے بغیر خود ہی مجھے اندر کمرہ میں مولانا مدظلہ العالی کی خدمت میں پہونچا دیا، شام کو کھانے کے وقت دسترخوان پر بھی یہ بزرگ موجود تھے، یہاں بھی وہ بالکل خاموش تھے مگر حضرت مولانا کی طرح وہ بھی اشیائے خورد و نوش میری طرف بڑھاتے اور اس کو کھانے کا اشارہ کرتے۔ رات کو میں انہیں کے بارے میں سوچتا رہا کہ عجیب قسم کے بزرگ ہیں، اتنے متواضع، اتنے مخلق اور اتنے مہمان نواز مگر زبان سے ایک لفظ نہیں فرماتے، ساتھ ہی بار بار دل میں یہ سوال اٹھتا کہ آخر یہ ہیں کون صاحب، یقیناً مولانا مدظلہ کے قریب ترین عزیزوں میں سے ہوں گے۔ صبح کو بھی یہی خیال ذہن میں گردش کرتا رہا، لیکن ان کے بارے میں سوال کرنے سے ایک تو ادب مانع رہا دوسرے یہ بھی واقعہ ہے کہ اگرچہ میں حضرت مولانا کی خدمت میں زیادہ رہنے اور آپ کے اعزاء میں گھلا ملا رہنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا مگر بغیر کسی استحقاق کے طبیعت کا احساس شروع ہی سے کچھ اس طرح کا تھا کہ گویا میں مولانا کا ایک عزیز ہوں اور میرا مولانا کے کسی قریبی عزیز کے بارے میں پوچھنا کہ یہ کون صاحب ہیں یا ان کا نام معلوم کرنا اپنے اس احساس کو مجروح کرنا تھا اور میں اس میں خفت محسوس کرتا تھا کہ مولانا کے اعزاء کے علم میں یہ بات آئے کہ میں اُن سے اتنا ناواقف اور دُور ہوں کہ ان میں سے کسی فرد کے تعارف اور نام جاننے تک کا محتاج ہوں اس لئے میں کسی سے ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے کسی ذریعہ سے خود ہی معلوم ہوگیا کہ وہ صاحب مولانا علی میاں مدظلہ کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور حضرت مولانا کے بھانجوں یعنی محترم جناب مولانا محمد ثانی صاحب مدیر رسالہ "رضوان" استاذ محترم جناب مولانا محمد رابع صاحب ندوی اور جناب مولانا محمد واضح صاحب ندوی کے والد محترم ہیں۔ اور یہ بھی کہ آپ خلقی طور پر سماعت و گویائی سے معذور ہیں، مجھے ان کی معذوری کا یاد دہانی کرکے پچھلی ملاقات کے وقت کلام نہ

کرنے کی وجہ تو معلوم ہوگئی پھر بھی یہ سنکر قدرے تعجب ہی ہوا، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح کے معذور آدمی کا چہرہ اس کی معذوری کو خود ہی ظاہر کرتا اور اس کے اور غیر معذورین کے مابین چہرہ کے انبساط و انقباض میں کھلا ہوا فرق ہوا کرتا ہے، لیکن ان کے چہرے پر اس قسم کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم کے بعد میرا قیام اپنے وطن میں کم اور صوبہ بہار اشرف کے علاقہ برار میں زیادہ رہا، بوجہ مسافت کی وجہ سے رائے بریلی کی میری حاضری کا اوسط بہت ہی کم رہا، تاہم جب بھی وطن آنا ہوتا تو مولانا علی میاں کی زیارت کا شوق اور اس مقام کی تاریخی عظمت رائے بریلی کی حاضری کا ذریعہ بن جاتے، اور یہ واقعہ ہے کہ وہاں سب سے زیادہ اُنس اور قلبی طور پر سب سے زیادہ کشش جس ہستی کی طرف محسوس ہوتی، وہ انہیں مرحوم کی ذات تھی، سب سے زیادہ جو چیز میں ان کے چہرہ سے پڑھتا وہ تھا ان کا سکون قلب اور اطمینان خاطر۔ آپ ایک ایسے انسان کا تصور کیجئے جو پیدائشی طور پر سماعت اور گویائی سے ناآشنا ہو، نہ اپنے دل کی بات کسی سے کہہ سکتا اور نہ کسی کی سن سکتا ہو اس کو قدرتاً جتنا ملول، جتنا مغموم اور کبیدہ خاطر رہنا چاہیئے، ہمارے لئے اس کا تصور کوئی دشوار بات نہیں۔ لیکن ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ حال تو اُن کا وہ ہے جو بیان کیا گیا، مگر ایک لمحہ کے لئے بھی وہ مغموم اور کبیدہ نہیں دیکھے جاتے۔ اگر خاموش رہنا تو پورے وقار اور سکون کے ساتھ اور یا پھر مسکرانا اور ہاتھ کے اشاروں سے بات کرنا لیکن اپنے حق میں قدرت کے فیصلہ پر نہ رنجیدہ، نہ بے صبر اور نہ ملول۔ اول سے آخر تک جو چیز دل پر گہرا اثر کرتی تھی وہ اُن کا یہی وصف تھا کہ جب کوئی مہمان آتا اور مرحوم اس وقت باہر موجود ہوتے تو مہمان کی آمد پر اس طرح خوشی اور گرم جوشی کا اظہار فرماتے کہ گویا آنے والا کسی اور کے پاس نہیں بلکہ براہ راست بس انہی کے پاس آیا ہے، اور اس کا سفر گویا انہیں انہی کی خدمت میں حاضری کی غرض سے ہوا ہے۔ مرحوم سے متعلق یہ میرا تجربہ اور ذاتی احساس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رائے بریلی جس کو بھی جانے کا اتفاق ہوا ہوگا اس نے کسی نہ کسی حد تک اس چیز کو ضرور محسوس کیا ہوگا۔ جب بھی رائے بریلی حاضری ہوئی تو ان بزرگ محترم کی زیارت و ملاقات کے مشاہدہ اکثر مجھے یہ خیال ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلاحیتوں کا کتنا بڑا خزانہ عطا فرمایا ہے کہ ایک شخص جو نہ بولنے پر قدرت رکھتا اور نہ سن سکتا ہے، وہ بھی خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لے کر اپنی مسکراہٹ اور اپنے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کے ذریعہ دلوں پر اثر انداز ہوتا اور لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ اور بلا مبالغہ کسی آمیزش کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ زندگی میں اللہ کے جن چند خصوصی بندوں کو دیکھ کر دل نے گواہی دی کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نفس مطمئنہ کی دولت سے نوازا ہے اُن میں یقیناً ایک ہستی یہ بھی تھی، جو نہ کسی سے کچھ کہتی اور نہ کسی کی کچھ سنتی تھی۔ بس اپنے پیدا کرنے والے کی بندگی کرنے اور اس کی مرضی اور فیصلہ پر سر تسلیم خم رکھنے ہوئے سوچنا نہ زندگی گزار دینے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔

اب جو ان کی وفات کی خبر سنی تو بالکل ایسا لگا کہ گویا اخلاق اسلامی کا ایک نمونہ، صبر و ثبات کی

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

یورپ پر اسلامی اندلس کے احسانات

(محمد عبد الرشید ندوی)

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال، ترقی و انحطاط کا ایک عبرتناک مرقع ہے جس سے مردہ قومیں سبق حاصل کرتی ہیں، اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور ایک نئے عزم، نئے جوش، نئے ولولے کے ساتھ اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے میں مصروف ہوجاتی ہیں —— تاریخ ایک قوی محرک ہے جو انسان کے جذبات و احساسات اور اس کی نفسیات پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور انسان کی قوت گفتار کے بجائے قوت کردار کو ایک نیا رخ، نیا رنگ، نیا آہنگ دیکر انسان کو گفتار کے بجائے کردار کا غازی بناتی ہے۔

آج سے تیرہ سو سال پہلے جب دنیا کفر و ضلالت، جہالت و سفاہت کی تاریک وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہی تھی عین اسی وقت بطحا کی سنگلاخ وادیوں سے رشد و ہدایت کا مہکتا ہوا آفتاب نمودار ہوا، جس نے مشرق و مغرب، شمال و جنوب غرض کہ دنیا کا ایک ایک گوشہ منور کردیا، اور یورپ کی وہ برباد شدہ قوم جو ظلم و ستم کی پیکر، قتل و غارتگری کی خوگر تھی آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں شفقت و رحمت، رافت و محبت کا جیتا جاگتا نمونہ بن گئی اور دنیا نے ان میں وہ عظیم شخصیتیں دیکھیں جنکی تاریخ عالم نظیر نہیں ملتی، ان ہی بے مثال شخصیتوں میں ایک طارق بن زیاد جیسی عظیم شخصیت بھی ہے جس نے محض اپنی ہمت جوانمردی، استقامت و پامردی، اور آہنی عزم کیوجہ سے جزیرہ اندلس کو فتح کرلیا۔ یہی وہ اندلس ہے جہاں کے علوم و فنون، ایجادات انکشافات، تہذیب و تمدن یورپ کی ترقی اور اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جتنے مفید ثابت ہوئے شاید ہی کوئی دوسرا تمدن کسی تمدن پر اتنا زیادہ اثر انداز ہوا ہوگا، اندلس فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے اسے محض ایک نوآبادی ہی بنانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسے علم و فن، تہذیب ثقافت کی شمعوں سے جہاں علم و تہذیب کا ایک دیا بھی روشن نظر نہیں آتا تھا، اسی ملک میں ہر ہر شہر، ہر ہر گاؤں کو علماء و فضلاء، ادباء و اطباء، ریاضی داں و ہیئت داں اور علوم رمل و نجوم اور فلکیات کے ماہرین سے بھر دیا، اور ایک ایک گھر کو علم و فن، تہذیب ثقافت کی شمعوں سے منور کردیا، گویا سرزمین اندلس علوم و فنون کا ایک آسمان بن گئی جس پر علم و فن، تہذیب و تمدن کے ان درخشاں ستاروں نے سرزمین اندلس کو جگمگا دیا، قرطبہ ہو یا طلیطلہ، غرناطہ ہو یا اشبیلیہ، ہر شہر علم و فن کا مرکز بن گیا، جس سے اندلس کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک کے طلباء بھی استفادہ کرنے لگے، اندلس ہی کے ذریعہ اہل یورپ علم و فن، ادب و فلسفہ سے روشناس ہوئے کیونکہ یورپ کے طلباء بلا کسی امتیاز اندلس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے، اور تہذیب و ثقافت، علم و فن، ادب و فلسفہ سے بہرہ ور ہوکر اپنے اپنے ملک میں جاتے تھے اور علم و فن کی روشنی پھیلانے کا سبب بنتے تھے۔

مسلمانوں نے جس وقت اندلس پر قبضہ کیا اس وقت یورپ جہالت و سفاہت کی تاریکیوں ہی بھٹک رہا تھا، یورپ کے سارے ممالک علوم و فنون کی روشنی سے محروم اور تہذیب و ثقافت سے کافی دور تھے، جہالت اور وحشیانہ زندگی ان کے لیے سرمایہ فخر تھی، ثقافتی و تمدنی اعتبار نہ وہ آرام و راحت کے لطف سے واقف تھے اور نہ زندگی کی دیگر آسودگیوں سے واقف تھے، جس کے اصل اسباب کلیسائی حکومت اور اس کے ظلم و ستم تھے، علم و فن، سائنس و فلسفہ، کی تحصیل ایک ناقابل معافی جرم تھا علم و عقل کی وہ باتیں جو اندلس کی اسلامی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے یورپ پہنچ رہی تھیں، ان کے روکنے اور تاریکی کو باقی رکھنے کے لئے جاسوسی کا محکمہ قائم کیا گیا، اور اس محکمے کے ذریعہ (۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۱ء) دس سال کے قلیل عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ چند دہ ہزار انسانوں کو محض اس لئے تہ تیغ کردیا گیا یا جلا دیا گیا کہ وہ علم و حکمت، سائنس و فلسفہ کی باتیں نوک زبان یا نوک قلم پر لائے تھے، مثلاً وی ڈی کو مسئلہ ارتقا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے آگ میں زندہ جلا دیا گیا، برونو کو ذہنی ترقی کے سبب دہکتی آگ میں جھونک دیا گیا، کوپرنیکس کو زمین کی گردش اور آسمان اور آسمان کو ساکت بتانے کی وجہ سے تہ تیغ کردیا گیا، اور گلیلیو کو اسی کے نظریہ کی حمایت کرنے کی وجہ سے جلاوطن کردیا گیا، یہ سب پاپائی تعصب اور عیسائی حکومت کے مظالم کی چند مثالیں ہیں، اب ذرا اندلس میں مسلمانوں کی ترقی اور یورپ کی پستی کا حال ڈاکٹر ڈی ایپر کی زبان سے سنیئے۔

"اپریل ۷۱۱ء کا واقعہ ہے کہ بربر جم طالی مطلع یورپ پر نمودار ہوا اس وقت اس بر اعظم پر جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اہل یورپ وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے ابھی مسلمانوں کو اندلس پر قابض ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ عربوں نے نور علم سے گھر گھر روشن کردیا، غرناطہ، طلیطلہ، قرطبہ اشبیلیہ وغیرہ مشہور شہروں میں علوم و فنون تہذیب تمدن نے وہ ترقی کی کہ مسلمانوں کے بعد اندلس کو وہ دیکھنا پھر نصیب نہیں ہوئے، غروب آفتاب کے بعد وہاں کی صاف و شفاف اور پختہ سڑکوں پر ہر شخص دس میل تک سرکاری لیمپوں کی روشنی میں چل سکتا تھا، —— اور اس وقت کے لندن و پیرس کے بازاروں میں ایک لیمپ بھی نہ تھا۔ خاص کر پیرس کا حال تو یہ تھا کہ اگر برسات میں کوئی شخص گھر میں داخل ہوتا تو دہلیز پر پیر رکھتے ہی ٹخنوں تک کیچڑ میں لت پت ہوجاتا —— خلفاء کے محل تو درکنار وہاں کے اصطبل بھی جرمنی و فرانس اور انگلینڈ کے بادشاہوں کے محل سے بدرجہا بہتر تھے اندلس میں علوم و فنون، ادب و فلسفہ کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ خود خلفاء اندلس ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ، سائنس و فلسفہ کے بڑے ماہر ہوتے تھے، انھوں نے اپنی قلمرو میں اس قدر مدارس اور مکاتب کھول رکھے تھے جسکا شمار مشکل ہے۔

مسلمانوں کی سائنس و فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ سے غیر معمولی دلچسپی اور اس میں حیرت انگیز کامیابی دراصل قرآن مجید کی ان آیات پر غور و فکر کرنیکا نتیجہ تھی جو انسان کو کائنات کی تحقیق و جستجو کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ ان ہی آیات کا ثمرہ تھا کہ اندلسی دور میں مسلمانوں نے چھان بین کی اور تحقیق و تفتیش جس کی بدولت موجودہ سائنس کی بنیاد پڑی، مسلمان سائنس دانوں نے جغرافیہ ریاضی، فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، فلکیات اور طب وغیرہ میں شاندار کامیابی حاصل کی اور یورپ کو نئے نئے علوم سے آگاہ کیا اس دور مشہور سائنس دانوں میں، جابر ابن حیان، محمد ابن موسیٰ خوارزمی، محمد بن زکریا رازی، ابو النصر فارابی، محمد بن راشد اندلسی، ابن نفیس، ابوالقاسم زہراوی، ابوعلی سینا، ابوریحان البیرونی وغیرہ قابل ذکر ہے جنکی بلند پایہ تحقیقات اور شہرہ آفاق تصنیفات ہی یورپ نے جدید کی بنیاد رکھی ہے۔

صرف یہی نہیں اندلس کے مسلمانوں نے تمدن کے ہر شعبہ کی داغ بیل ڈالی اور اسے بام عروج تک پہنچایا، اعلیٰ نظام حکومت قائم کیا، معیشت کے وافر وسائل جمع کرکے خوش باش زندگی گزاری، علوم و فنون، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت اور تعمیر میں ایسے کارنامہ انجام دیئے جو ہمیں کر یورپ کی تمدنی نشاۃ ثانیہ میں کبھی فراموش نہیں ہوسکتے، یہی وجہ تھی کہ اندلسی مسلمانوں کے درخشاں تمدن و ثقافت نے قدرتی طور پر یورپ میں قبولیت عام حاصل کرلی تھی کیونکہ دو قسم کے تمدن ایک جگہ جمع ہوئے تو اعلیٰ تمدن کے مالک فریق ادنیٰ پر اثر انداز ہوتے ہیں یہی صورتحال اندلس اور یورپ کی ہوئی اور اندلس کے اس عربی تمدن کو تیرہویں صدی تک یورپ میں فروغ عام حاصل رہا —— اسلامی علوم و فنون، تمدن و ثقافت کی اشاعت میں یورپ میں فرانسیسی اور اٹلی میں فریڈرک دوم کا نام قابل ذکر ہے، اگرچہ یہ فرمانروا اندلس و سسلی میں بچھے اسلامی علوم و فنون سے اپنا دماغ روشن نہ کرتا اور پھر اس کے ہاتھوں یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی روشنی نہ پھیلتی تو یورپ کی موجودہ علمی و سائنسی ترقیاں سیکڑوں برس کے لئے پیچھے رہ جاتیں۔ فریڈرک دوم نہ صرف اندلس و سسلی کے اسلامی تمدن و ثقافت کا عامل تھا بلکہ اس نے دوسرے اسلامی ملکوں کے اسلامی علوم و فنون بھی یورپ میں منتقل کئے اس طرح وہ یورپ کے اس عظیم واقعہ کا حقیقی بانی ہوا جسے نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اندلس کے تمدن میں خاص کر جو چیز کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی وہ قطب نما کی ایجاد ہے، یہی وہ قطب نما ہے

جس کے سہارے کولمبس امریکہ تک پہنچ گیا، یورپ کے مشہور فاضل "اگر اہل اندلس قطب نما ایجاد نہ کرتے تو کولمبس جیسا عالی دماغ شخص بھی بحر اٹلانٹک کی بھیانک موجوں سے زندہ بچ کر نہ پہنچ پاتا، اسی میں بھٹکتے ہوئے اپنی زندگی کے آخری لمحات گذار دیتا" ۔۔۔ بہر حال اسلامی تہذیب وتمدن کے لیے یہ بات باعث فخر ہے کہ وہ یورپ کے جدید تمدنی وسائنسی ترقیوں کا سبب بنے، اگر آج بھی یورپ کی تمدنی اور سائنسی ترقیوں کا سراغ لگایا جائے تو ثقافت وتمدن، علم وفن کے ہر شعبہ میں اندلس کے اسلامی تمدن وثقافت کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ موجود ملیں گے۔ یورپ کے عقلائے [illegible] نظام، دستور حکومت، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت اور دیگر علوم وفنون حاصل کر سائنس کے نئے علوم کی تحقیق اور ترقیاں خود یورپین اور عیسائی اہل علم وقلم کے بیانوں کے مطابق [illegible] اسلامی اثرات موجود ہیں۔

"تمدن عرب" کا مشہور مصنف ڈاکٹر لیبان رقمطراز ہے "تمدن اسلامی کا بہت زبردست اثر ساری دنیا میں رہ چکا ہے مسلمانوں نے اہل یورپ کی ان وحشی قوموں کو انسان بنایا جنھوں نے رومیوں کی سلطنت تہ وبالا کر ڈالی تھی، مسلمانوں نے یورپ میں علوم وفنون، ادب وفلسفہ کا دروازہ کھول کر اہل یورپ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس سے یورپ میں ناواقف تھے، مسلمان پانچ سو برس تک مشرق سے مغرب تک سارے یورپ کے استاد رہے ہیں، انہی سے یورپ نے تمدن وثقافت حاصل کیا، انہی کی معاشرت اور تقلید نے یورپ کے امراء کی عادتیں درست کیں اور انھیں بہترین انسانی اخلاق سکھائے، عربوں نے محض انکشافات ہی کے ذریعہ ترقی نہیں دی، بلکہ انھوں نے یونیورسٹیوں کے اور مصنفات کے ذریعہ بھی اس کی اشاعت کی، اس خاص امر میں یورپ کو جو فائدہ حاصل ہوا وہ بے انتہا ہی تھا۔"

[illegible] ہندوستان کا مشہور [illegible] لکھتا ہے کہ عرب فلسفیوں اور سائنس دانوں کی [illegible] سے یونانی علوم کا [illegible] جدید سائنس کی [illegible] عربوں ہی کی [illegible] کی [illegible] علوم کا [illegible] خدا کی [illegible] پہنچی۔

[illegible] علوم وفنون [illegible] یورپ میں [illegible]

عباسی، فاطمی حکمرانوں کی روشن خیالی اور آزادانہ حکومت میں الشیا، شمالی افریقہ اور اندلس میں علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کو بے حد فروغ حاصل ہوا، سمرقند وبخارا سے مراکش وقرطبہ تک ہزار ہا حکماء وادباء علم ہیئت وریاضی، طبعیات وکیمیا، طب وموسیقی کے ماہرین بلاکسی تخصیص ہر کس وناکس کو تعلیم دیتے تھے۔ یونانی فلسفہ اور یونانی علوم کا گراں بہا خزانہ عیسائی کلیسا کی تنگ نظری اور اوہام پرستی کے نیچے دفن ہو چکا تھا اگر عربوں اور اندلسی مسلمانوں کی ان تھک کوشش نہ ہوتی تو یہ علوم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے اور دنیا کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچتا جس کا اندازہ مشکل ہے۔ جدید یورپ نے عربوں سے طب اور ریاضی ہی نہیں بلکہ علم ہیئت کا سبق بھی پایا، انسان کی نظر وسیع کر دی ہے اور قدرت کے میکانکی قوتوں کو بے نقاب کیا ہے، عربوں نے اس علم کو بہت ترقی دی، نئے آلات کے ذریعہ کرۂ ارض کا قطر اور سیاروں کی گردش اور ان کی صحیح تعداد اسی وقت پتا لگایا جبکہ علم ہیئت، نجوم، رمل اور جوتش کی شکل میں مشرقی ممالک کے پنڈتوں کے پٹارے میں بند تھا۔"

موسیو لیبان لکھتا ہے کہ عربوں کا اثر مغربی زمین پر بھی اتنا ہی رہا ہے جتنا مشرق میں، اور انھیں کی بدولت یورپ نے تمدن حاصل کیا، یورپ میں عربوں کے علوم جنگ صلیبی کے ذریعہ نہیں پہنچے بلکہ اندلس، جزیرہ صقلیہ (سسلی) اور اٹلی کے ذریعہ انھیں فروغ عام ہوا، اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جائے تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کئی صدی تک پیچھے ہٹ جائے گی۔"

ڈاکٹر [illegible] لکھتا ہے "اسلام کے مسئلہ کی [illegible] پر ان واقعات کا اضافہ ضروری ہے کہ [illegible] انھوں نے بحر روم میں اپنے [illegible] اندلس، جزیرہ کو فتح کیا، پھر سسلی کو مسخر کیا [illegible] روما کو ذلیل ورسوا کیا، البتہ اس امر کا [illegible] ضروری علوم جنھوں نے [illegible] اطالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی وعلمی ترقی کو ایک بہت بڑی تحریک پہنچی، [illegible] فراموش ہے لیکن پھر بھی یورپ نے نہایت بے باکی اور جرأت سے مسلمانوں کے احسانات کو پس پشت ڈالکر انھیں فراموش کرنا چاہا۔"

مشہور امریکی مصنف ڈریپر یورپ کی احسان فراموشی پر [illegible] لکھتا ہے "یورپ کے عیسائی مصنفین نے [illegible] خود اس کا [illegible] سائنس جب [illegible] کا ذکر [illegible] ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ جس چیز میں کوئی ذم کا پہلو نہ نکال سکیں اسے چھپائیں اور جسے چھپا نہ سکیں اس کی تنقیص کریں، یورپ کے مؤرخین نے جس طریقہ سے مسلمانوں کی سائنٹفک علمی وادبی احسانات کو پس پشت ڈالدینے کی کوشش کی ہے اس پر مجھے سخت افسوس ہوتا ہے مگر وہ یقیناً بہت دیر تک چھپ نہیں سکتا، وہ ناانصافی جو مذہبی بغض وعناد پر مبنی ہوا سے ثبات حاصل نہیں ہوتا۔"

عماد نامی ایک مغربی محقق یوں رقمطراز ہے "مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ کس منظم طریقہ سے یورپ کے اہل قلم ان احسانات کو جو مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں ہم (یورپین قوموں) پر کیے نظر انداز کر دیا، یقینی طور پر انھیں بہت عرصہ تک پردۂ خفا میں نہیں رکھا جا سکتا، وہ بے انصافی جو مذہبی بغض وعناد اور قومی غرور پر مبنی ہے ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔" جیسا کہ ابھی ہوا جب بعض منصف مزاج عیسائی مورخوں کی حقیقت پسند نگاہوں نے احسان فراموشی، بغض وعناد، تعصب وہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو انھوں نے نہایت فراخدلی کے ساتھ پرزور الفاظ میں اپنے اوپر مسلمانوں کے بے پایاں احسانات کا اعتراف کیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اہل یورپ، یورپ کی ترقی اور نشاۃ ثانیہ کے لیے اسلامی اندلس کی تہذیب وثقافت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں، جرمن کا مشہور مورخ [illegible] مسلمانوں کے احسانات کا اعتراف اس طرح کرتا ہے "اسلامی تہذیب دنیا میں جلوہ فگن نہ ہوتی تو ہماری (اہل یورپ) کی کیا حالت ہوتی؟ انہیں احسان مندی کی رو سے ہم پر واجب ہے کہ عربی علوم وفنون نے ہمارے علوم اور فنون پر جو حیرت انگیز اثر ڈالا ہے اس کو [illegible] اگر عربوں نے فلسفہ ارسطو کا یونانی سے ترجمہ نہ کیا ہوتا اور پھر عربوں کی معرکۃ الآراء تالیفات وتصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر ہم تک نہ پہنچ گئی ہوتیں تو ہم اس فلسفہ کی اصل یونانی کتابوں کے حصول سے بہت مدت پیشتر ہی اس کا علم کیونکر ہو سکتا تھا، چند سو سال قبل ہی کا زمانہ لیجئے یورپ کے تشنگان علوم کے لیے اندلس کے عربی واسلامی دار العلوم ہی چشمۂ شیریں تھے، اور سچ پوچھو تو آج بھی جبکہ اسلام [illegible] اسلام کے سیاسی علوم سے بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں تو [illegible]

یورپ کا [illegible] لکھتا ہے "یورپ کی نشاۃ ثانیہ چند صدیوں میں نہیں ہوئی بلکہ عربوں کے اندلس اور اسلامی ثقافت کی تجدید کی [illegible] میں منت ہے، اس نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اسلامی اندلس تھا، یورپ بربریت کی اسفل ترین گہرائیوں تک گر چکا تھا، ذلت کی تاریکیوں میں ڈوب چکا تھا جبکہ اسلامی شہر بغداد، قاہرہ وغیرہ تہذیب وتمدن کی سرگرمیوں کے درخشندہ مرکز تھے، جوں ہی اسلامی ثقافت یورپ پر اثر انداز ہوئی، وہاں ایک نئی حرکت ظہور میں آگئی۔

آکسفورڈ کے مدرسہ فکر میں ان ہی اندلسی مسلمانوں کے جانشینوں سے راجر بیکن نے عربی زبان وادب اور عربی سائنس سے استفادہ کیا، یورپ کے تمدنی نشو ونما میں کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جاتا ہو، ہماری سائنس پر عربوں کے احسانات نہ صرف انقلاب انگیز دریافتوں، سائنسی نظریات وایجادات تک محدود نہیں بلکہ عرب کا تمدن ہماری سائنس پر اس سے بھی عظیم ترین احسان ہے، بہت ممکن تھا کہ اگر عرب نہ ہوتے تو موجودہ یورپی تہذیب وہ ہیئت نہ اختیار کر پاتی جو آج اسے ارتقاء کی تمام منزلوں پر فوقیت بخش رہی ہے۔

یو۔ این۔ او سے خطاب

(از سید اسماعیل حسرت [illegible])

لب سے اس بات کا اقرار کیا تھا تم نے
صرصر جنگ کے جھونکوں کو نہ چلنے دوگے
اور راحت کدۂ ارض جہاں میں ہرگز
فتنہ وظلم کے سانپوں کو نہ پلنے دوگے
ہم نے جانا تھا کہ گلشن میں بہار آئے گی
اور پیغام سکوں باد صبا لائے گی
حیف صد حیف مگر کس کو خبر تھی اس کی
باغ ہستی میں تشدد کی گھٹا چھائے گی
تیری ناپاک سیاست پہ تعجب ہے مجھے
تو نے ہی صلح کی ہر بات کو تسلیم کیا
امن کے نام پہ اک ڈھونگ رچا کر جھوٹا
تو نے ہی جنگ کے سامان کو تقسیم کیا
اپنی ناپاک سیاست کو بدل کر پھر سے
زلف گیتی کو سنوارو تو کوئی بات بنے
تیغ بیداد سے کچلے ہوئے انسانوں کو
نغمۂ امن سناؤ تو کوئی بات بنے

نسل انسانی کی تعمیر وتخریب میں عقیدہ کی اہمیت

تلخیص وترجمہ: — ادریس احمد دربھنگوی (متعلم ادب دوم)

نسل انسانی کی تعمیر وتخریب اور معاشرے کی تشکیل میں عقیدہ کو بہت بڑا دخل ہے، تمام اعمال اور اخلاق وافکار اسی محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس لیے کامیاب نسل اور صالح معاشرہ کا وجود بغیر صالح عقیدہ کے ناممکن ہے عقائد کی گرفت جب تک مضبوط رہتی ہے پاکیزہ اخلاق نمودار ہوتے ہیں، جذبۂ خدا پرستی پیدا ہو کر صالح معاشرہ اور پاکیزہ نظام زندگی میں وجود میں لاتا ہے، لیکن عقائد کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس کا انجام صرف ہلاکت وبربادی ہے۔

آج انسانیت حلقۂ دین اور ثابت شدہ عقائد سے آزاد ہونے کے بعد اس مقام پر پہنچ چکی ہے، جہاں اس نے اپنی گردن سے دین ومذہب کا قلادہ اتار پھینکا ہے اور افکار وتقالید میں تبدیلی کی صدا لگانی شروع کر دی ہے جس کے آثار ان ممالک میں ظاہر ہو رہے ہیں جو (?) مادی حیثیت سے انتہائی خوشحال خیال کیے جاتے ہیں۔

ان آثار کا مختلف صورتوں میں ظہور رہا ہے، تقسیم ثروت کی بدنظمی ایک مستقل مرض بنتی جا رہی ہے، جس کے نتیجہ میں ایک طرف حد سے بڑھتی ہوئی دولت اپنے پر نکال رہی ہے تو دوسری طرف غربت وافلاس کا اژدہا پھنکار رہا ہے۔ سرمایہ داروں کی جانب سے فقراء کے دلوں میں کینہ، نفرت اور غم وغصہ کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے جس نے پوری سوسائٹی کو بھڑکتے ہوئے شعلے سے قریب تر کر دیا ہے۔

۲۔ عوام میں ذلت ورسوائی اور خوف کا احساس اس حد تک بیدار ہو چکا ہے کہ کتنی قربان گاہ میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور خون کی دھاریں بہہ پڑتی ہیں، جس کے نتیجہ میں صرف روس میں ربع صدی کی مدت میں مسلمانوں کی دو کروڑ ساٹھ لاکھ کی تعداد فنا کے گھاٹ اتار دی گئی۔ اسی طرح یوگوسلاویہ میں بھی دس لاکھ مسلمان اسی جذبۂ کینہ ونفرت کی نذر ہو گئے۔

۳۔ اخلاقی وذاتی پستی نے خود مادی زندگی کو ہلاکت سے قریب کر دیا ہے، اسی طرح اعصابی بے چینی، ذہنی انتشار، نفسیاتی وجسمانی بیماریاں متعدد قسم کی چھوت کی بیماریاں، جنسی بے راہ روی اخلاقی حیثیت کا انقطاع اور پست ہمتی اس خوشحال سوسائٹی میں خطرناک حد تک رونما ہو چکے ہیں، خاص کر امریکہ میں جنسی امراض کے لیے سینکڑوں ہسپتال مخصوص ہیں — برطانیہ کے باخبر حلقوں کی اطلاع کے مطابق نوے فیصد امریکی نوجوان جنسی امراض میں گرفتار ہیں اس کے علاوہ بعض دوسری بیماریاں بھی وبائی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ تقریباً ۳۰ ہزار سے ۴۰ ہزار تک بچے سالانہ موروثی بیماری سے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔

مذکورہ حالات نے بہت سے نوجوان کو فوجی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے، پہلی جنگ عظیم میں فرانس نے ۵۰ ہزار افراد کو اسی بنا پر فوج سے نکال دیا تھا کہ وہ فوجی صلاحیت کھو بیٹھے تھے۔ امریکہ میں لاکھوں نوجوان فوجی منصب سے معزول کر دیے گئے اور یہ وہی لوگ تھے جن کی فوجی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔

ان افکار ونظریات کا نتیجہ بعض وہ مظاہر بھی ہیں جو انسانیت کو حیرت واضطراب وپریشانی کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ جیسے بیٹلزم (?) اور اس جیسی دوسری جماعتوں کے مظاہر جو امریکہ کی سلامتی کے لیے ایک بہت خطرہ بنتی جا رہی ہے ان کی محفل عیاشی شاہراہوں پر منعقد ہوتی ہے۔ کھانا پینا، بول وبراز اور بعض نامناسب حرکتیں وڈھنگ انسانیت سوز حرکتیں وسط شاہراہ پر کرتے ہوئے بھی ان کو عار نہیں آتی ہے۔

سید قطب شہید اپنی کتاب "خصائص التصور الاسلامی" کا مندرجہ ذیل اقتباس اس مقام کے نہایت مناسب ہے۔ سید صاحب مرحوم لکھتے ہیں: "ذی فہم اور بیدار مغز انسان جو اس حواس باختگی سے محفوظ ہے جس نے شکست خوردہ انسانیت کو جکڑ رکھا ہے، جس وقت ذلیل ورسوا انسانیت کا جائزہ لے گا، اس کو اپنے تصورات وحالات اور نقالی ونامناسب حرکات میں مبتلا پائے گا۔ انسانیت بالکل برہنہ ہو چکی ہے اس کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک طرف کرب والم سے کراہ رہی ہے تو دوسری طرف بیہوشی کے عالم میں پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی ہے، اسے ہر لمحہ کسی نامعلوم شئی کی تلاش ہے اور ہر لحظہ خیالات وتصورات کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ اپنا قیمتی سرمایہ کھو کر گندی اور قابل نفرت چیزوں کو گلے لگا رہی ہے۔ مقومات انسانی اور اخلاق وبلند فکری کے احساسات بالکل ختم ہو چکے ہیں۔۔۔

۔۔۔ ان کے افکار ونظریات، دعوت وتبلیغ اور حرکت وعمل کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ لوگ زندگی سے مسلسل بھاگ رہے ہیں، گویا کہ انھیں دھکا دے رہی ہے، کبھی رکنے کا نام نہیں لیتے۔ بلکہ خود اپنی مخبوط ومضطرب اور ہولناک شخصیت سے فرار اختیار کر رہے ہیں، کسی چیز میں قرار نہیں ملتا اور نہ ان کا کسی مستحکم مرکز سے کوئی تعلق رہ گیا ہے، اس شکست خوردہ انسانیت کے گرداگرد مہلک اور باغیانہ اضطراب سے نفع اندوز ہونے والی ساہوکاروں، فلم سازوں، پوشاک گروں، صحافیوں اور مصنفوں کی ایک بھیڑ نظر آتی ہے جو نعرہ بازی کر کے ان کے خبطی پن اور شکست خوردگی میں اضافہ کر رہی ہے، جب یہ ننگ انسانیت تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور قدم بوجھل ہو جاتے ہیں تو صحیح مرکز نجات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور پھر تازہ دم ہو کر لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ ایسی جماعتیں بھی ان کی پشت پناہ ہیں جو انھیں ایسے انقلاب اور جدید رجحان کا درس دیتی ہیں جو ہر قید وبند سے آزاد ہو۔ یہ پوری انسانیت اور پیغام ورسول انسانیت کے لیے گھناؤنا جرم ہے کسی طرح کم نہیں ہے"۔

یہ تمام ہلاکت خیز اور گمراہ کن حالات اس کا نتیجہ ہیں کہ ان کے پاس کوئی صالح اور محکم عقیدہ نہیں ہے۔ ہر خیز دین وملت اور ضابطہ اخلاق سے وہ بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ان کے پاس زندگی کا کوئی مثبت انجام نہیں۔ زندگی کی ساری تابندگی دشادابی موت پر ختم ہو جاتی ہے، جس کے بعد زندگی اور اس کے عواقب کا کوئی تصور نہیں ہے، جس نے ان کی زندگی کو گھٹا ٹوپ تاریکی اور انسانیت کو بھیانک طوفان میں لا کر ڈال دیا ہے۔

اس کے برخلاف اگر اسلامی تہذیب اور مسلم معاشرے کا جائزہ لیا جائے اور مغربی تہذیب وتمدن کے خدوخال سے موازنہ کیا جائے تو اسلامی معاشرہ معراج انسانیت کا حامل نظر آئے گا۔ اور مغربی سوسائٹی ذلت انسانیت کی آئینہ دار دکھائی دے گی۔

اسلامی نسل کی تعمیر ایک محکم اور ثابت شدہ عقیدہ پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان میں نفسیاتی ٹھہراؤ، سکون قلب اور دیر تشنگی پوری طرح سے ہوگی۔ سراسیمگی اور اضطراب کا نام ونشان تک نہیں پایا جاتا ہے۔ ہر شخص کی آواز یہی ہوتی ہے کہ "ہم لوگ ایسے خوش حالی میں ہیں کہ اگر بادشاہوں کو اس کی لذت کا احساس ہو جائے تو اسے حاصل کرنے کے لیے ہم سے جنگ کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے"۔

حضرت عبداللہ بن مبارک سے کسی نے دریافت کیا کہ بادشاہ کون ہے۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ جو لوگ دنیا کی چمک دمک سے بے نیاز ہیں — سائل نے پھر پوچھا، "ذلیل وکمتر کون ہے؟" جواب دیا "جو اپنے دین کو ذریعہ معاش بناتا ہے۔" سائل نے اس سے بھی بدتر اور پست اخلاق سے سوال کیا، حضرت نے فرمایا وہ لوگ انتہائی رسوا ترین انسان ہیں جو اپنا دین وایمان ضائع کر کے غیر کی دنیا سنوارتے ہیں۔

حضرت رابعہ عدویہ مندرجہ اشعار اکثر پڑھا کرتی تھیں۔

فلیتک تحلو والحیاۃ مریرۃ
ولیتک ترضی والانام غضاب
ولیت الذی بینی وبینک عامر
وبینی وبین العالمین خراب
اذا صح منک الود فالکل ہین
وکل الذی فوق التراب تراب

(کاش زندگی تلخ ہوتی اور تو خوشگوار وشیریں ہوتا — لوگ مجھ سے ناراض ہوتے اور تو خوش ہوتا — ہمارے تمہارے درمیان آباد منزل ہوتی لیکن ہمارے اور دنیا والوں کی درمیانی دنیا ویران ہوتی — جب تمہاری محبت حاصل ہو گئی تو ہر چیز کمتر اور ہیچ ہے کیونکہ زمین کی ہر چیز خاک ہے اور خاک ہو جائیگی)

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اسی سلسلے کی ایک حدیث روایت کی ہے، آنحضور علیہ السلام نے فرمایا۔

عجبا لامر المومن ان امرہ کلہ خیر ولیس ذلک لاحد الا للمومن ان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا لہ وان اصابتہ

ومن یتق و یصبر فکان خیراله (او کما قال)

(اہل ایمان کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا سارا معاملہ بہتر ہی ہے۔ اسے اگر کوئی خوشی حاصل ہوئی اور اس نے خدا کا شکر کیا تو اس کے لئے بہتر ہے اور اگر کوئی تکلیف پہنچے اور اس نے صبر کیا تو بھی اس کے لئے بہتر ہے۔)

کسی بھی مسلمان کے دل کی گہرائی میں جب اسلامی عقیدہ اتر کر راسخ ہو جاتا ہے تو وہ کبھی بھی ذہنی انتشار اور قلبی اضطراب میں گرفتار نہیں ہوتا ہے ـــــ جس کی چند وجہیں ہیں، اس کے سامنے کوئی ایسا کائناتی سوال ہی نہیں جو اضطراب کا باعث ہو، اس کا ایمان ہے کہ خدا ایک ہے ساری کائنات اس کی مخلوق ہیں اور وہی ان کا مدبر بھی ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ انسان ایک مٹی کا پتلا ہے جسے خالق کائنات نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے اور اس میں روح پھونک دی گئی ہے۔ پھر وہ جنت سے سفر کر کے زمین پر اترا ہے۔ اس کے لئے ایک سیدھی راہ ہے جس پر چلنا ہی اس کو پہلے مقام (جنت) میں پہنچا دے گا۔ وہ سیدھی راہ قرآن مجید اور سنت نبوی کی پیروی ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہے کہ اس کا ایک سرکش دشمن بھی ہے جو اس کے لئے جنت سے نکلنے کا سبب ہے اس کے رب نے ان تمام سوالات سے بواسطہ پیغمبر علیہ السلام مطلع کر کے اس کو پرسکون اور مطمئن کر دیا ہے۔

ہر مسلم کا ایمان ہے کہ دنیا آخری مقام نہیں ہے اور نہ جزا و سزا یہاں ملے گی ہر انسان کو خدا کے پاس جانا ہے انسان کے بس میں صرف کوشش ہے جس کا انجام ضرور سامنے آئیگا، اور پورا بدلہ دیا جائے گا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ سوف یریٰ ثم یجزاہ الجزاء الاوفیٰ وان الیٰ ربک المنتہیٰ.

مسلمان یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں اس سے فوت کر جائیں گی، آخرت میں ان کا بدل ضرور ملے گا، اور دنیاوی زندگی کی مدت آخرت کے مقابلہ میں گھڑی دو گھڑی سے زیادہ کی نہیں ہے۔ فما متاع الحیوٰۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل (دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں کے مقابلہ میں تھوڑا ہے) یہ تمام اسباب اس کے اندر اطمینان و سکون پیدا کرتے ہیں۔ اور اس کے دل میں جذبۂ نیک بختی کو پروان چڑھا کر اسے اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ مناسب قول و عمل سے اپنے کو محفوظ رکھے اور اچھے کاموں میں انجام کرے۔

جذبۂ ایثار و قربانی بیدار کرتے ہیں، اور وہ جنت کی طمع کرتے ہوئے خدا کی راہ میں اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ یہی جذبۂ ایثار و قربانی حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس قول میں کار فرما نظر آتا ہے جو انہوں نے قیصر روم کے سامنے کہا تھا، جئتک بقوم یحبون الموت کما تحبون الحیاۃ (میں تمہارے پاس ایسی قوم لے کر آیا ہوں جو موت کو اسی طرح محبوب رکھتے ہیں جس طرح تم زندگی کو)

اسلام کی اسی اعلیٰ تربیت نے بنی عبدالدار کی خاتون میں بے نظیر حوصلہ و بلندی پیدا کر دی کہ جب اسے اپنے والدین بھائی اور شوہر کی شہادت کی خبر دی جا رہی تھی وہ آنحضورؐ کی خیریت دریافت کر رہی تھی ـــ اور آنحضورؐ کی خیریت کا حال سنکر جوش مسرت سے کہہ اٹھی تھی، کل مصیبۃ بعدک جلل یا رسول اللہ (اے اللہ کے پیغمبر آپ کے بعد ساری مصیبتیں ہیچ ہیں)

ہر جاندار کی روزی اور اس کا اجل متعین ہے۔ کوئی بھی جاندار بغیر حکم خداوندی موت کی گرفت میں نہیں آسکتا اور نہ اپنی روزی پا سکتا ہے۔ خدا ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے، آسمان و زمین کے خزانے اسی کی ملک ہیں، عزت و ذلت کا وہی مالک ہے، اس کے فیصلہ کا کوئی تعاقب نہیں کر سکتا ہے۔

یہی وہ اعتقاد ہے جو ابن تیمیہ جیسی شخصیتیں وجود میں لاتا ہے، جس نے اپنے زمانہ کے حکام بالا کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا، "تم میرا کیا بگاڑ سکو گے، اگر قتل کرو گے، شہید ہوں گا، قید کرو گے خلوت گزیں ہونگا جلاوطن کرو گے سیاحت کروں گا ـــ" یہی قوت قاضی ابن عبدالسلام کی ذات میں موجود تھی کہ جب شاہ اسماعیل کے قاصد نے ان سے کہا تھا کہ بادشاہ کے ہاتھ کو بوسہ دو تو وہ دوبارہ منصب قضا پر سرفراز کر دیگا تو قاضی ابن عبدالسلام نے جواب دیا تھا، "واللہ لو قبل یدی ما قبلت یدہ" ـــ (خدا کی قسم وہ میرا ہاتھ بھی چوم لے تو بھی میں اس کا ہاتھ نہیں چوم سکتا، لوگو اس کی راہ الگ ہے میری راہ الگ ہے۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے اس ذمہ داری سے محفوظ رکھی ہے جس میں تم مبتلا ہو)

یہ اس نسل اسلامی اور مسلم معاشرہ کے خد و خال ہیں، جن کی تعمیر ایک عمدہ اور صالح عقیدہ پر ہوئی ہے۔

و باللہ التوفیق وصلی اللہ علیہ نبیہ الکریم۔

ــــ دو انسان ہیں جو مسلمانوں کے اندر

بقیہ ص۱۷ احمد اللہ شاہ

بڑھ رہے تھے کہ اچانک ان پر گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی، واپسی کا راستہ بند تھا بھاگنا یوں بھی مرد مجاہد کی شانِ مردانگی کے خلاف ہے۔ موصوف وہیں گولیاں کھا کر شہید ہو گئے، یہ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) کا واقعہ ہے۔ ان لوگوں نے مزید ظلم یہ کیا کہ لاش نذر آتش کر دی اور سر کاٹ کر کوتوالی دروازہ پر لٹکا دیا۔ راجہ پوائن کو اس "غدر" خدمت کے صلہ میں فیروزشاہ نے ۵۰ ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔

مولانا دھوکہ سے مار تو دیئے گئے مگر ان کی موت نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ دوست تو دوست دشمنوں نے بھی ان کی بڑائی کا اعتراف کیا، اور اصلی فضیلت تو وہی ہے جس کے دشمن بھی معترف ہوں، چنانچہ اس جنگ میں شریک ہونے والا ایک انگریز جنرل طامس لکھتا ہے:۔

"احمد اللہ شاہ بڑی لیاقت اور قابلیت کا آدمی تھا اسے خوف نہیں آتا تھا۔ وہ عزم کا پکا اور ارادہ کا مستقل تھا۔ باغیوں میں اس سے بہتر کوئی سپاہی نہ تھا۔ یہ فخر اسی کو حاصل ہے اس نے سر کالن کیمبل کو میدان جنگ میں شکست دی، دوسرے باغیوں کی بہ نسبت خطاب شاہی کا زیادہ حقدار تھا۔ وہ یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا اس نے تلوار کو کبھی اس نے مخفی اور سازشی قتل سے آلودہ نہیں کیا۔ وہ بہادرانہ اور باعزت طریقے سے ان لوگوں سے برسرپیکار ہوا جنھوں نے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو اس کی شجاعت و صداقت کی وجہ سے بہت ادب و تعظیم سے یاد کریں گی اور وہ اس کا مستحق بھی تھا ـــ ● ●

بقیہ ص۷ نفس مطمئنہ کی حامل ایک بزرگ ہستی......

ایک زندہ تصویر اور نفس مطمئنہ کی دولت سے مالا مال ایک پُرعظمت ہستی سے ہم محروم ہو گئے اور ہم نے اس کی زندگی سے وہ سبق نہیں لیا جس کی خاموش دعوت یہ شخصیت دے رہی تھی اور اس احساس کے نتیجہ میں حسرت بھی ہوئی اور اپنی محرومی پر رنج بھی۔

اللہ تعالیٰ لے جانے والے کو اس کے مثالی صبر و ثبات اور اللہ کے فیصلوں پر اس کے راضی رہنے کا اپنی شانِ کریمی کے حساب سے اعلیٰ سے اعلیٰ اجر عطا فرمائے۔

بقیہ ص۱۹ تامل ناڈو، کرناٹک......

ہونے کے باوجود اردو داں حضرات اردو کی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہیں، نیو کالج میں جنوبی آرکاٹ کے سینکڑوں مسلمان طلبا وہ ہیں جو اردو زبان سیکھنے کے دل سے خواہشمند ہیں وہ بڑی حسرت سے اردو تقریریں پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی سنتے ہیں اور دکنی یوں کی حسرت سے ورق گردانی کرتے ہیں مگر اردو داں حضرات خاص طور پر وہ حضرات جن کا مسئلہ معاش تک اردو زبان سے وابستہ ہے یعنی کالج اور یونیورسٹی کے اردو ڈپارٹمنٹ کے اساتذہ ان کو تک اس کا احساس نہیں کہ وہ اردو زبان کی تعلیم و اشاعت کے لئے کچھ وقت دیں۔ اردو زبان کی بقا، ترقی اور سہولت کے لئے جہاں انتظامیہ سے ہم مطالبہ کرتے ہیں وہیں اپنی ذمہ داری کو بھی کچھ محسوس کریں تو کتنی بڑی خدمت ہوگی نہ صرف زبان کی بلکہ جنوب و شمال اور برصغیر کے باشندوں کی معتدبہ تعداد کو ہم اردو کے ذریعہ ایک ممتاز و منفرد کلچر و تہذیب سے آشنا اور آراستہ کر سکتے ہیں، اردو کے وسیع ذخیرۂ کتب سے استفادہ ان ہزاروں نوجوانوں کے لئے ممکن ہوگا جن پر ذرا سی توجہ کر کے ہم اردو سکھا سکتے ہیں۔

جنوبی ہند خاص طور پر مدراس کے اردو دوست احباب خدا کرے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرما کر کوئی عملی قدم اٹھائیں۔

پروفیسر سید علی صاحب نے میری واپسی کا ٹکٹ میری ہدایت کے مطابق پونہ کا لیا تھا، مگر مدراس پہونچنے کے بعد پونہ کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ ۲۶ر مارچ کو مجھے منگلور پہونچنا تھا، جہاں کی مجلس اصلاح و تنظیم نے مجھے مدعو کیا تھا تنظیم کے سکریٹری کا تار اور ڈاکٹر ابو علی صاحب پرنسپل انجمن کالج بھٹکل کا خط مجھے مدراس میں مل گیا تھا اور اب نظام یہ طے ہوا کہ میں ویلور، عمرآباد، وانمباڑی ایک ایک روز قیام کرتا ہوا بھٹکل پہونچوں۔ ڈاکٹر عزیز تمنائی کی کوشش واثر سے منگلور کا ریزرویشن ہوگیا، کاکا محمد عمر صاحب نے سفر کا نظام بنایا اور ایک رفیق (مولوی عبدالکریم صاحب عمری) کو مقرر کیا۔ نصف شب کے بعد میں بستر پر لیٹا تو یہ سوچتا ہوا کہ انشاء اللہ کل کی شب ویلور مدرسہ باقیات الصالحات میں ہوگی "حیات اوقی سفر کے سوا کچھ اور نہیں"

(جاری)

افقِ عالم پر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آثار

(عصمت اللہ متبنی ندوی)

مغربی تہذیب و تمدن، اس کے اثرات و نفوذ، غیر اسلامی افکار و اقدار کی اشاعت قوموں، ملتوں، خصوصاً نئی نسل کی کورانہ تقلید سے آج کون انکار کر سکتا ہے ـــ دنیا کے چپہ چپہ میں اس کے کرشمے نظر آتے ہیں، عراق و عرب، ترکستان و افغانستان ہندوستان و پاکستان، چین و جاپان، غرض اس وقت دنیا کا کونسا ایسا مقام ہے جہاں اس کی سحرکاریاں نہیں، یہ الگ بات ہے کہ کہیں مکمل شکست خوردگی اور سپردگی ہے، کہیں اس سے کچھ کم ـــ

اس سلسلہ میں اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ اسلامی ملکوں کا حال، ان کے ماضی کی شاندار روایات اسلاف کے کارنامہ، اور اسلامی قوانین و احکام کے نفاذ میں ان کے گذشتہ تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے یورپ و امریکہ اور غیر اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں انتہائی خراب ہے ـ بقول مولانا علی میاں مدظلہ ... اس سلسلہ میں بعض ممالک اس سفر کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہیں اور اپنی منزل مقصود تک یا تو پہنچ چکے ہیں یا اس کے قریب ـــ اور بعض ممالک ابھی دوراہے پر ہیں لیکن آثار و شواہد صاف بتا رہے کہ:۔

داغ جانا تھہرا صبح گیا شام گیا

اس پرفتن اور پرآشوب حالات میں جبکہ ہر طرف فرنگی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے میخانہ کے شور و غل سے لیکر مسجد کے پرسکون و اطمینان بخش ماحول تک، بازار کے ہنگاموں سے لیکر خانقاہوں کی خاموش اور عافیت بخش فضا تک، باغوں اور پارکوں کے سرسبز شاداب مناظر سے لیکر بلند اور فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں تک، ندی نالوں کے کناروں سے لیکر دریا و سمندر کے ساحلوں تک، غرض ہر جگہ اور ہر گوشہ میں تہذیب مغرب کے اثرات و نفوذ، انسانی قلب و نظر پر اس کا تسلط، اسلام دشمنی کے مظاہرے، اسلامی احکام و قوانین کی پامالی، ماضی کی روایات اور اسلاف کے کارناموں کا خون ـــ غرض ہر چیز یہاں تک کہ انسانیت کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے ان حالات و ادوار میں اگر ہم کسی اخبار رسالہ میں یہ چیز پڑھتے ہیں کہ:۔

۱ ـــ انڈونیشیا میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت زوروں پر ہے، سینکڑوں مسلمان اس میں دلچسپی لے رہے ہیں ـــ اور حکومت انڈونیشیا ہر طرح سے ان کی مدد کر رہی ہے یا یہ کہ:۔ ـــ

۲ ـــ ملیشیا میں مسلمانوں کا نوجوان طبقہ علی الاعلان فحش و بے حیائی کا ارتکاب کرتا ہے ـــ اور اس کو اپنے لئے باعث فخر اور روشن خیالی تصور کرتا ہے ـــ یا یہ کہ:۔ ـــ

۳ ـــ افغانستان میں خواتین پردہ کی کھلم کھلا مخالفت کرتی ہیں، اور علما، حکومت سے بحث کر کے عورتوں کو مردوں کے مساوی درجہ دینے، طلاق کا اختیار دینے اور تعدد ازدواج کو بالکل ختم کرنے کا مطالبہ کرتی ہیں یا یہ کہ:۔ ـــ

۴ ـــ مصر جیسے اسلامی ملک میں وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ، ادبا و شعرا، مصر کو یورپ کا ایک ٹکڑا سمجھنے، مصری عوام کے ذہن و فکر کو مغربی سانچے میں ڈھالنے، غرض تمام نظام ہائے زندگی میں ان کی مکمل پیروی خیر و شر، تلخ و شیریں ـــ اور پسند و ناپسند ہر چیز میں مغربی تہذیب و طرز عمل کو اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں ـ یا یہ کہ:۔ ـــ

۵ ـــ شام کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ، سیاسی رہنما اور اہل حکومت کا رجحان برابر لادینیت تجدد و مغربیت کی طرف ہو رہا ہے، بلکہ پروگرام، آزادانہ تفریحی مشاغل اور عورتوں مردوں میں اختلاط روز افزوں ہے ـ یا یہ کہ:۔ ـــ

۶ ـــ عراق میں عرب نیشنلزم دن بدن ترقی پر ہے، اشتراکی رجحانات ملک میں اس قدر حاوی اور قابو یافتہ ہو چکے ہیں کہ اسلام پسندوں کا اس ملک میں رہنا اور اپنے خیالات کی تبلیغ کرنا اب ناممکن ہو گیا ہے ـــ یا یہ کہ:۔ ـــ

۷ ـــ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کے جانشین ترکی معاشرتی زندگی میں انقلاب لا رہے ہیں تحریک نسواں، مذہب و سیاست کی علیحدگی وحدت نظام تعلیم کا قانون ـــ مذہب بیزاری کی اشاعت عروج پر ہے ـ یا یہ کہ:۔ ـــ

۸ ـــ تونس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ کمالی اصطلاحات و تجدد جاری ہے، فرانسیسی تہذیب و ثقافت کے مطابق تونس کی جدید تشکیل ہو رہی ہے۔ شوہروں کے اختیارات بہت کچھ محدود کر دئے گئے ہیں ـــ اور یہ ملک جدت پسندی کی طرف سرگرم سفر ہے، یا یہ کہ:۔ ـــ

۹ ـــ الجزائر جس کی آزادی کی قیمت دس لاکھ شہیدوں کی صورت ادا کی گئی ـــ وہاں کے سربراہ عوام کے جذبہ اور دینی عناصر کی توقعات کے برخلاف ملک کو لادینیت اشتراکیت کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہاں اسلام سے مراد ان کے نزدیک وہ اصلاح شدہ (Reformed) مذہب ہے جو مغربی تہذیب و تمدن ـ اور افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہو سکے ـــ یا یہ کہ:۔

۱۰ ـــ صومالیہ میں زیاد بری کی حکومت مارکسی و لینینی نظریات کو ملک میں پھیلا رہی ہیں، تحلیل خمر و خنزیر قرآنی آیات کے خلاف جنگ، علمائے کرام و دین پسند طبقہ کے ساتھ بدسلوکی و دشمنی، ان کی گرفتاری، قید و بند اور قتل و غارت گری، نکاح، طلاق اور میراث کے شرعی احکام میں تبدیلی کر کے مارکسی اصول و ضوابط کے مطابق ملک کا نظام نظم و نسق بنا رہے ہیں یا یہ کہ:۔

۱۱ ـــ عرب میں جہاں حضورؐ نے عربوں کو، جاہلیت کے غار سے نکال کر اسلامی تہذیب و تمدن سے آشنا کیا، کھانے پینے چلنے پھرنے، غرض انسانوں کی طرح زندگی گذارنا سکھایا، یہاں تک کہ وہ دنیا کے مہذب ترین قوم بن گئی ـ جسکو اس مرتبہ پر حضورؐ نے پہونچایا، اور اس زمانے کے قیصر و کسریٰ جیسے شہنشاہ ان عربوں سے خوف کھانے لگے، اور اب بھی دنیا میں مالدار ترین اور مہذب ترین شمار ہونے لگے، تو وہاں کا کوئی سربراہ امت محمدی ہونے اور اسلام کے ادنیٰ خادم ہونے پر فخر کرنے کے بجائے عرب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور کنا العرب قبل ان نکون مسلمین جیسے الفاظ زبان سے نکالنے میں شرم و حجاب محسوس نہیں کرتے۔

یہ چند اسلامی ملکوں کے بارے میں اخبارات، رسائل اور تازہ ترین کتابوں میں شائع شدہ بالکل صحیح خبریں و اطلاعات ہیں اس میں کسی قسم کا کوئی مبالغہ یا رنگ آمیزی نہیں ـــ اب یہ چیزیں کسی شخص کے لئے نہ حیران کن اور نہ اس میں استعجاب کی کوئی گنجائش ـــ حیرت و تعجب تو اس وقت ہوتا جب ان ملکوں میں یہ اسباب وسائل و ذرائع نہ ہوتے ـــ مال و زر کی فراوانی نہ ہوتی، غیر ملکیوں کا اثر و رسوخ نہ ہوتا، مسلمان اسلامی احکام و شعائر سے عملی واقف اور اس پر سختی سے کاربند ہوتے تو ان حالات میں تجدد پسندی، اور مغرب زدگی کے متعلق سنتے تو یقیناً تعجب حیرانی ہوتی ان خبروں پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا، اب تو مسلم ممالک میں بے پردگی مخلوط تعلیم، ورزش کے مقابلوں میں شرکت، اعلیٰ تعلیم کے بہانے طالبات کا یورپ کا سفر، ساحل سمندر غسل آفتابی، فلمی کمپنیوں میں تمثیل (ایکٹنگ) روز مرہ زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن پر چند باحمیت مسلمانوں اور بعض دینی جماعتوں کے سوا کوئی کچھ بھی چیں بہ جبیں اور متاسف نہیں۔ نگاہیں ان مناظر کی عادی، اور ذہن و دماغ ان واقعات کے خوگر، اور کان ان خبروں سے مانوس ہو چکے ہیں ـ

لیکن ـــ آج حالات و واقعات اور ان خبروں و اطلاعات کے ساتھ ساتھ اگر کوئی بالکل اس کے برخلاف کہیں اسلام پسندی، مادیت و الحاد کے مراکز میں دینی دعوت و تبلیغ کی خبریں آئیں ـــ مثلاً یہ کہ:۔

۱ ـ امریکہ کے جیسے کہ جیسے خالص تہذیب مغرب کے مرکز میں احادیث نبوی پر سیمینار منعقد ہو رہا ہے ـــ یا یہ کہ:۔

۲ ـ جاپان جیسے ملک میں جو ایشیائی ممالک میں صنعت و حرفت، سائنس و ٹکنالوجی، میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ، امریکہ و روس کا مقابلہ کرنے والا ملک میں اسلام کی اشاعت روز افزوں ہے، اور وہاں اسلامک سنٹر قائم ہو رہے ہیں، یا یہ کہ:۔

۳ ـــ کوریا میں اسلام دن بدن پھیل رہا ہے، اور کوریا کے مسلمان اسلامی احکام و شعائر پر سختی سے عمل پیرا ہیں ـــ یا یہ کہ:۔

۴ ـ افریقہ و یورپ کے مختلف شہروں میں تبلیغی جماعت سے لوگ بہت متاثر ہیں اور بہت سے غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر راہ خدا میں نکل رہے ہیں، یا یہ کہ:۔

۵ ـــ کیسیس کلے جیسا ایک غیر مسلم بگڑا انسان محمد علی کلے بن کر اسلام پر فخر و خوشی کا اظہار کر رہا ہے، اور وہ ہر مقابلہ میں کامیابی و کامرانی کا راز اسلام ہی کو قرار دیتا ہے ـــ یا یہ کہ:۔

۶ ـــ ترکی میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش میں اسلامیت غالب اور مغربیت

مغلوب ہو رہی ہے ۔ مغرب زدہ طبقہ یہاں تک کمال کے جانشین بھی اس کے معترف اور اس پر شکست پر حیران و متاسف ہیں۔

جب اس قسم کی خبریں ہماری نظر سے گذرتی ہیں اور اس پر تفصیلی غور و خوض ہوتا ہے جبکہ ہر طرف لادینیت اور مادیت پرستی کا دور دورہ ہے ـــ کہیں سے اسلام پسندی، دینی احکام و شعائر پر پابندی کی خبریں کانوں میں پڑتی ہیں، تو ایک قسم کی خوشی و مسرت، فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہے ، اسلام کی حقانیت پر ایمان اور پختہ ہو جاتے ہیں، اور مسرور بار خداوندی میں کچھ نیز ہو جاتا ہے ۔

تمام اسلامی ملکوں میں شاید ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے ، جہاں ایک طویل عرصے کفر و اسلام کی جنگ ، مشرق و مغرب کی کشمکش ، ایمان و مادیت کا معرکہ اسلامی و غیر اسلامی تہذیبوں کی کھینچا تانی اور رسہ کشی زور دار رہی ہے ، اس کشمکش اور معرکہ میں ادھر ایک عرصے سے اکثر اسلامیت مغلوب اور مغربیت غالب رہی ہے ۔

ورنہ ایک زمانہ وہ تھا جب ترکی میں خلافت عثمانیہ قائم تھی ، جو دنیا کے تین بڑے بڑے براعظموں ، ایشیا ، یورپ ، افریقہ پر بیک وقت حکومت کرتی تھی ، اور صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی کے آخر تک تقریباً ۵ سو سال تک جاری رہی اور اس قدر طویل عرصے تک پرچم اسلام لہراتا رہا ـــ یہی خلفاء تھے جنہوں نے ، قسطنطنیہ کو فتح کیا ، اور یورپ کے ممالک کو زیرنگیں کیا ، خلفائے عثمانیہ میں یوں تو بہت سارے نامور اور جلیل القدر و عظیم الشان خلفاء گذرے ہیں ، ان میں چند قابل ذکر سلاطین میں سے سلطان مراد ، سلطان محمد فاتح ، سلطان بایزید ، سلطان سلیم ، اور سلطان عبدالحمید ایسے سلاطین ترک تھے جنہوں نے شان و شوکت سے ، حکومت کی ـــ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۸۵۳ء تک تو یورپ کو اتنا قصور کیا جاتا ، اور ترکی کو ایک قہر الٰہی سمجھا جانے لگا جسے خدا نے تادیب یورپ کے لیے مقرر کیا تھا ـــ ترکی عساکر کے سامنے یورپ کی بڑی سے بڑی اور طاقتور سے طاقتور فوج بھی ٹھہر نہیں سکتی تھی ـــ گویا یہ فتح و نصرت غلبہ و قوت کا زمانہ تھا ـــ لیکن بمرور زمانہ کے ساتھ ساتھ سلاطین عثمانی کے اندر احساس کمزوری اور خواہش میں تبدیلیاں آنے لگیں ، اور تجدد ، مغربیت ، اور بیج مغربی میں مغربیت کا غلبہ آہستہ آہستہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۵۳ء میں زار نکولس اول نے ترکی کو یورپ کا مرد بیمار قرار دیا ۔

۱۹۱۸ء میں ترکی کا آخری وقت تصور کیا گیا ، ۱۹۱۹ء میں کم و بیش اس کی موت کا گمان ـــ اور ۱۹۲۲ء میں یقین کامل ہو گیا کہ ترکی صفحۂ ہستی سے معدوم ہوا ہی چاہتا ہے کہ اچانک اس مریض کے اندر ملی قوتیں بیدار ہوئیں ، اب میں ایک نئے طرز سے ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا ، ایک طویل اور مسلسل کشاکش حیات کے دوران ترکی نے سینائے فرنگ سے بیشتر خوابیدہ اور جدید روح پر ور قطرات پی ، وہ چکھے اور اپنی دیرینہ تصویر کو بدل ڈالا ، اس اصلاح کا بانی ، اور تجدد و اصلاح کا ہیرو مصطفیٰ کمال اتاترک تھا ، جس نے ترکی کو ایک نازک وقت میں ایک ایسے خطرے سے بچایا جو کہ موت و زیست کا سوال بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کے بانی اور تجدد و اصلاح کے ہیرو کو غیر معمولی شہرت و عزت حاصل ہوئی ۔

کمال اتاترک کی قیادت ترکی میں لامذہبیت ، ماضی سے انحراف ، بلکہ ایک زبردست بغاوت اور عسکری آمریت کی قیادت تھی ، اور اس کا یہ موقف مغربی تہذیب کے مقابلہ میں شکست خوردگی ، مکمل سپردگی ، مغرب زدگی بقول شخصے کہ "ایک عقیدت مند سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادتمند شاگرد کا تھا جو ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہونچا تھا" ۔

غرض اس طرح اس نے تمام گذشتہ روایات کو توڑ کر جبراً اس نے نظام کو نافذ کیا جو ظاہر میں نہایت خوبصورت ، حسین ، دلکش اور اندر سے ڈھول کی طرح کھوکھلا اور غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا ، ایک مدت قلیل میں یہ پورے ترکی میں پھیل گیا ، گویا ہر موقع ترکی کی تاریخ میں اسلامیت کی مغلوبیت کا تھا ، اتاترک یہی چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ تا دیر قائم رہے اور ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو کمالی اصطلاحات و تجدد کو باقی بلکہ مزید اسے قوت پہونچاتے رہے ۔

لیکن دوسری طرف اسلام پسند طبقہ علماء و صوفیاء کا گروہ تھا ، جس کو طبقہ سے یہ خدشہ تھا کہ اس کے بعد کہیں یہ نظام نہ بدل جائے اور جس پودے کو اس نے انتہائی محنت و مشقت سے ترکی کی سرزمین میں لگایا کہیں اکھاڑ کر پھینک نہ دیا جائے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں اپنے انتقال سے چند سال قبل اس نے مجلس ملی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ۔

" اگر ملک نے محض مصطفیٰ کمال کی قدر و محبت سیکھی جو گوشت و ہڈیوں کا بنا ہوا ہے تو وہ بہت جلد تم سے غائب ہو جائیگا لیکن اگر تم میں سے ہر ایک مصطفیٰ کمال ہوگیا تو یقیناً تم نے اس کی قدر کی " ۔

۱۹۳۸ء میں اتاترک کا انتقال ہو گیا اور جمہوریہ ترکی کا صدر ترک قوم نے بیک زبان اتاترک کے دوست اور اس کے ہمراز غازی عصمت انونو کو بنایا ، جس کو صحیح کمالی جانشین قرار دیا جاسکتا ہے ۔

اسلامیت و مغربیت کی کشمکش

کبھی کسی زمانہ میں ترکی میں ختم نہیں ہوئی ، علماء کرام ، صوفیاء عظام اور اسلام پسند طبقہ برابر اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں لگا رہا یہ الگ بات ہے کہ کمال اتاترک اور اس کے جانشینوں کی جبری حکومت کے مقابلہ میں اس طبقہ کو مغلوب اور دب کر رہنا پڑا ، لیکن جس خاموشی اور احتیاط کے ساتھ اشاعت و تبلیغ اور تعلیمی اصلاح کا جو نظام ترکی میں چلایا وہ آہستہ آہستہ کامیاب ہونے لگا ۔ یہاں تک کہ کمالی جانشین غازی عصمت کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا اور وہ سمجھ گیا کہ جلد اس ملک میں انقلاب آنے والا ہے ، لیکن اس کا اعتراف وہ علی الاعلان تو کر نہیں سکتا تھا ، لیکن جب اس کی موت قریب آئی اور اس اعتراف کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو مرض الموت میں اس انتہائی دکھ درد میں کہا ۔

" اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہم نے اسلام کو ترک قوم سے اکھاڑ پھینکنے ، مغربی تہذیب و تمدن کو اس کی جگہ لانے میں بے انتہا جدوجہد کوشش کی ، اور اسی کو مقصد بنا لیا لیکن جس چیز کی کبھی ہم توقع نہیں کر سکتے تھے جو ہماری اس کوشش و محنت کے بعد خواب و خیال میں بھی نہ تھا اس کا ظہور ہو رہا ہے ـــ ہم نے لادینیت و مغربیت کا بیج ڈالا تھا لیکن اس کی جگہ اب اسلام کا درخت نشو و نما پا رہا ہے ، اور برگ و بار لا رہا ہے " ۔

الغرض اسلامیت و مغربیت کی یہ رسہ کشی ، حق و باطل کا یہ معرکہ ترکی کی تاریخ میں زمانۂ ماضی سے جاری ہے ، اس کا صحیح اندازہ مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم کی کتاب " ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش " اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب " مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش " اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں " جمہوریہ ترکی " وغیرہ کے مطالعے سے ہوگا ۔

اس وقت عرب اخبارات و رسائل میں ترکی کے سلسلہ میں جو اطلاعات مل رہی ہیں ، اور جن صاف اور واضح الفاظ میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ ، مدارس و مراکز کے متعلق خبریں آ رہی ہیں وہ ہر مسلمان کے لیے خوشی و مسرت اور فخر کا باعث ہیں ۔ کیا عجب ہے کہ پھر ایک بار ترکی میں اسلام پسند طبقہ بالکل غالب اور مغربیت بالکل مغلوب ہو کر رہ جائے ـــ

عربی جرائد نے ترکی کی موجودہ صورتحال کو " العودة المباركة " قرار دیا ہے اور صریح الفاظ میں لکھا ہے کہ ترکی میں اس وقت جو حالات ہیں اور ترکی قوم میں اسلام پسندانہ دینی شعائر و احکام سے جو محبت و انسیت پیدا ہو رہی ہے اس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جاسکتا ہے " اس سلسلہ میں انھوں نے ترکی میں نشر ہونے والی دینی و اسلامی اخبارات و جرائد تعلیمی مدارس و مراکز ـــ طلباء و طالبات کے لیے الگ الگ تحفیظ قرآن کے شعبے اور مختلف معاہد و مشر کا مکمل اعداد و شمار بھی شائع کیا ہے "

مصطفیٰ کمال اور اس کے جانشینوں کی اس جابرانہ حکومت میں جہاں خود ان لوگوں کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اس ملک میں اب اسلام ، اور اسلام پسندوں کی ایک جماعت پیدا ہو سکتی ہے ، اور جہاں پھر سے اسلامیت نشو و نما ہو سکتی ہے ـــ

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی شخصیت ہے جو کمالی راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایمان و اسلام کی چنگاری کو نکالنے اور اس چنگاری سے بہت سی شمعیں اور چراغ روشن کرنے میں کامیابی حاصل کی ، اور جس نے اس مادیت اور الحاد کے درمیان رہ کر شمع ایمان کو فروزاں کیا ـــ اگر ماضی قریب میں ترکی کی تاریخ میں اس عظیم شخصیت کو تلاش کرتے ہیں تو وہ شخصیت ہمیں امام سعید نورسی کی شکل میں ملتی ہے جو ترک میں شیخ بدیع الزماں کے لقب سے مشہور تھے ، جنکو خداوند قدوس نے عقیدۂ راسخ ، رائے صائب عطا کیا تھا وہ انہی دو چیزوں کے ذریعہ سے دشمنان اسلام ، اور کمالی جانشینوں کی تمام سازشوں اور اسلام کے خلاف ہونیوالی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیتے ، اور ترکی میں مسلم نوجوانوں کے اندر حکمت و موعظت کے ذریعہ صحیح اسلامی جوش اور دینی حمیت پیدا کر دیتے ـــ حالانکہ شیخ سعید نورسی بھی ... یا تو نیوٹی کے تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن اللہ نے شاید

پورے ترکی میں کمالی اصلاح و تجدد و مغربیت کی سرکوبی کے لیے انہیں کو منتخب فرمایا تھا ، ان کو علماء کا ذہن و فکر ، علوم شرعیہ اور مصالح عصریہ کو سمجھنے کے لیے بہترین عقل و شعور اور دعوت و موعظت کے لیے بے مثال حکمت عطا فرمائی تھی ۔

امام سعید نورسی نے ان تمام واقعات و اصلاحات کا بذات خود مشاہدہ کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں ترکی میں رونما ہوا تھا ۔ مشرق و مغرب کی کشمکش اسلام اور مادیت کے ان ادوار سے گذر چکے جس میں خارجی طور پر مغربیت کو بہت زیادہ غلبہ حاصل ہوا ، اور کمالی اصلاحات و تجدد نے اسلامیت کو جڑ سے اکھاڑ دیا ـــ شیخ سعید نورسی چند روز تک ان واقعات کو دیکھتے رہے ، لیکن ایک درد مسلمان کی آنکھیں کب تک ان مناظر کو دیکھ سکتی تھیں ، ایک باحمیت و غیرت مند انسان کب تک اسلامیت کو اپنے سامنے مغلوب ہوتے ہوئے دیکھ سکتا تھا ، اور اس کی طبیعت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی ، چنانچہ وہ اٹھے اور اس کمالی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے اس طوفان کے مقابلہ میں آنا ہی گویا تمام خطرات و پریشانیوں کو دعوت دینا تھا ، دن رات کی راحت و آرام اور خوشی و مسرت کو رنج و غم ، فکر و پریشانی ، حکومت وقت یہاں تک اعزہ و اقرباء سے دشمنی

مول لینے کے مرادف تھا ، لیکن انھوں نے اسی زندگی کو ترجیح دی ، اور انتہائی خاموشی لیکن حکمت اور سوجھ بوجھ سے اپنی جد و جہد میں لگے رہے ، ان کی تقریر و تحریر اسی کے لیے وقف ہو گئی ـــ شروع میں وہ سیاسی میدان میں بھی حصہ لیتے تھے ، لیکن وقت کی نزاکت اور مصالح کے پیش نظر انھوں نے سیاسی میدان کو چھوڑ دیا اور یکسوئی کے ساتھ کمالی انجانی اصلاحات کے تلے دبی ہوئی ایمان و اسلام کی چنگاری سے شمعیں روشن کرنے ۔ جو الحاد و مادیت کے اس طوفان اور آندھی کے سامنے بھی گل نہ ہو سکی ، بلکہ ان کے شعلہ میں مزید قوت و زور اور روشنی آگئی ، یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء میں اس عظیم شخصیت کا انتقال ہو گیا ، جسے ترکی کا مجدد کہنا غلط نہ ہوگا ، اب ان کی جگہ ان کے خلفاء اور اسلام کے علمبردار سرگرم عمل ہیں ، اور دعوت و تبلیغ ، اصلاح و ارشاد کا سلسلہ جاری ہے ـــ

خدا وہ دن جلد لائے جب ان لوگوں کو مکمل قوت و طاقت حاصل ہو ، اور ایک مرتبہ پھر ترکی میں اسلام کا بول بالا ہو ـــ

ـ وما ذلك على الله بعزيز ـــ

غزل

از :ـــــــــــــ ڈاکٹر طفیل احمد مدنی

ان کا جمال تو بہ شکن دیکھتے رہے
اک شاہکار عظمت فن دیکھتے رہے

عرفان ذات دوست کا کیا کم ہے یہ ثبوت
ہر شے میں اس کو جلوہ فگن دیکھتے رہے

یہ بھی خبر نہ ہو سکی مصلوب کون تھا
ہم سب تو صرف دار و رسن دیکھتے رہے

چہرے سے ہم نے پڑھ لیا حال دل حزیں
اہل خرد لباس و بدن دیکھتے رہے

کمرے میں رینگ آئی تھی چھپکر جو پچھلی رات
ہم محو صبح تک وہ کرن دیکھتے رہے

سایہ کہیں بھی جب نہ ملا دھوپ میں تو ہم
حسرت سے اپنا سایۂ تن دیکھتے رہے

فرصت ملی کبھی تو دریچوں سے یاد کے
ہم دیر تک نقوش کہن دیکھتے رہے

نکلے تھے جب وطن سے تو مڑ مڑ کے دور تک
ہم جانے کیوں سواد وطن دیکھتے رہے

کس سے کریں گے شکوۂ بے داد اب طفیل
تم لٹ گئے اور اہل چمن دیکھتے رہے

محمد ارشد اعظمی

تھوڑی دیر مردانِ حق آگاہ کی بزم نورانی میں

میر سید طیب بلگرامی میر سید عبدالواحد بلگرامی صاحب سبع سنابل کے فرزند اور سجادہ نشین تھے ، علم و فضل ، زہد و ورع ، میں اپنی مثال آپ تھے ، آزاد بلگرامی نے ان کے متعلق لکھا ہے ، " دریں ذات مقدس است کہ اگر نقلش باز نمازی کنند ی زیبد و اگر زمین و زماں بر خود بالندی شاید " سید کرم اللہ جد سید العارفین میر شاہ لدھا کہا کرتے تھے " اگر کسے خواہد ملک را بر روئے زمین بہ بیند میر سید طیب را مشاہدہ کردہ ـــ

میر سید درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے ، ہدایہ تفسیر بیضاوی وغیرہ پر حاشیے عالمانہ حاشیے لکھے تھے ، ان میں اور محدث عبدالحق دہلوی میں بڑی محبت اور مودت تھی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے " در میان شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ و حضرت میر محبتے و مودتے عظیم بود ، شیخ عبدالحق بر عایت بزرگی او در شیخ طیب ای گفت " ایک بار میں ایک مرتبہ شیخ محدث درس دے رہے تھے کہ کسی مقام پر رک گئے اور فرمانے لگے کہ اگر میر سید اس وقت موجود ہوتے تو آسانی اس مشکل کو حل کر دیتے ، اتفاقاً میر اسی وقت آپہنچے شیخ بہت خوش ہوئے اور وہ مشکل ان کے سامنے پیش کی ، انھوں نے انھوں نے اس عبارت کو اس طرح پڑھا کہ مشکل خود بخود حل ہو گئی ، اس زمانے میں شیخ نور الحق " تعلیق الصدق " وشیخ عبدالحق آگرہ میں قاضی تھے ، شیخ محدث نے میر صاحب سے دریافت کیا کہ کس راہ سے آئے ؟ جب معلوم ہوا کہ آگرہ کی طرف سے آئے ہو تو فرمایا ، نور الحق سے ملاقات ہوئی ہوگی ؟ میر صاحب نے جواب دیا " سفر میں کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ ملنے کا موقع نہ ملا ، شیخ نے فرمایا " ظاہراً از جگہ او مرتکب فعلے شدہ اعراض بہ عمل آمدہ " پھر شیخ نور الحق کی تعریف کی اور کہا " اگرچہ او پسر من است اما بجائے پدر ، اگرچہ شاگرد من است اما بجائے استاد ، اگرچہ مرید من است اما بجائے پیر می دانم " ، میر سید طیب یہ سن کر اس طرح اٹھے گویا کسی ضرورت کے لیے جاتے ہیں لیکن اسی وقت آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے ، اور شیخ انور سے ملاقات کر کے واپس آئے ، شیخ عبدالحق ان کے اس اخلاق سے حد متاثر ہوئے اور یہ قول آزاد بلگرامی محمد رضا برزبان آوردہ ۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ ص ۔ ۲۴۹ و ۲۵۰)

ـــ (۲) ـــ

حضرت شیخ قاضی نظام الدین احمد صدیقی کیلانی جونپوری " (متوفی ۹۱۸ھ) نے گجرات کے اکابر علماء و ماہرین فن سے علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل فرمائی ، اور علم فقہ و اصول ، تفسیر و حدیث میں خصوصیت کے ساتھ بڑی قابلیت و مہارت پیدا فرمائی ـــ اپنے وقت میں آپ ہندوستان کے مایۂ ناز و معروف فاضل جلیل اور علامہ تھے سلطان ابراہیم شاہ شرقی والی دار السرور جونپور بہت علم دوست تھے ، اس بادشاہ کو علماء حقانی و فقراء ربانی کے جمع کرنے اور ان کی خاطر مدارات کرنے کا بہت ہی شوق تھا ، چنانچہ جب شاہ شرقی نے شیخ کیلانی کی فضیلت و عظمت کا شہرہ سنا تو آپ کو جونپور قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دی ، شیخ حسب الطلب دار السرور شیراز ہند جونپور تشریف لے گئے ، سلطان نے مراحم خسروانہ سے نوازا اور جونپور کا قاضی مقرر کر دیا ، شیخ نے بھی تقویٰ و تدین ، عدل و صداقت سے اپنے منصب کو انجام دیا ، اس کے ساتھ ساتھ دار تک علوم ظاہری کا درس بھی دیا ۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے ہم عصر تھے ، شیخ نظام الدین کا مرتبہ دینیات میں اس قدر بلند تھا کہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی استفتاء پر اس وقت تک مہر نہ فرماتے تھے جب تک شیخ نظام الدین کیلانی اس پر دستخط نہ فرما دیتے تھے ، قاضی شہاب الدین دوسرے علماء کرام کی دستخط کا اس وقت تے تھے ، ابراہیم شاہ مشرقی کے حکم سے کتاب " ابراہیم شاہیہ فی فتاوی حنفیہ " (فتاوی کی مشہور کتاب فتاوی قاضی خان کی طرح ہے) جو مرتب و مصنف حضرت شیخ نظام الدین کیلانی ہی ہیں

(نور اللہ مرقدہ ۔ تاریخ جونپور ۔ ص ۔ ۲۰۹)

قرطبہ، اور مسجد قرطبہ کا تاریخی پس منظر

(از: محمد ایوب، ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

روم وعرب کے درمیان سنہ عہد عثمانیہ ہی سے کام گاہے جھڑپیں جاری تھیں، کچھ عرصہ بعد ان ہی جھڑپوں نے اسلام اور عیسائیت کی جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی، دونوں قوموں میں عناد مذہبی اور اقتدار طلبی کی عصبیت نے زور پکڑ لیا تھا، مسلمانوں کا مطمع نظر ہمیشہ سے یہی ہوتا ہے کہ کمزوری کی بھرپور مدد کر کے انھیں ظالم اور جابر حکمرانوں کے آہنی پنجہ سے نکال کر وہاں کی سرزمین پر وحدانیت کا پرچم لہرایا جائے اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیش بہا تعلیمات اور ان کے اعلیٰ کردار اور جامع صفات کو دنیا کے گوشہ میں عام کیا جاوے، ان ہی بنیادی آئین کے پیش نظر اندلس کی زرخیز اور سرسبز زمین پر طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر (والی افریقہ) جیسے جانباز مجاہدوں کی سرگردگی میں عرب کے جاں نثار بہادروں نے فتح وظفر کے علم کو اس طرح سے لہرایا کہ ان کی بہادری اور دلیرانہ شان نے اندلس کے تمام صوبہ جات کی رعایا کے دلوں پر جاگزیں ہو نا ان کے قلب وجگر کو دہلا دیا اور انہی کی جاں نثاری کی وجہ سے عربوں کے مختلف قبائل وہاں آ کر آباد ہو گئے اور وہاں کے ایک وسیع خطہ کو اسلامی سلطنت کا جزو بنا لیا تھا، غرض کہ اندلس کے مسلمانوں نے کئی صدی تک فرانس کی سرزمین میں اسلامی پرچم کو بلند رکھا، اسپین، پرتگال، اور آدھا فرانس کا علاقہ اسلامی حکومت میں داخل رہے، خصوصاً اندلس میں مسلمانوں کی علمی، تمدنی، اور روحانی ترقیوں کی جو شمع روشن ہوئی اس سے ایک عالم نے روشنی حاصل کی شمالی یورپ کے نئے علوم وفنون اور تمدن کے مینارے ان ہی بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں۔

فاتح اندلس طارق بن زیاد (۹۱-۹۲ھ مطابق ۷۱۱-۷۱۲ء) نے ۷ ہزار کی قلیل فوج لیکر اندلس کی راہ، ابھی شروع کی تھی جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہسپانیہ کا حکمراں کثیر تعداد میں فوجوں کو اکٹھا کیے ہیں۔ تو طارق نے والی افریقہ موسیٰ بن نصیر کے پاس قاصد بھیج کر سارے حالات اور نتائج سے باخبر کیا، موسیٰ نے مزید پانچ ہزار فوج کی کمک بھیج کر طارق کے ہاتھوں کو مضبوط کر کے ان کے حوصلہ کو اور بڑھا دیا، غرض کہ مسلمانوں کی کل تعداد ۱۲ ہزار تھی، ادھر اندلس میں راڈرک (حاکم اندلس) نے ایک لاکھ لشکر جرار سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا ——— مگر تائید غیبی طارق کے حق میں تھی چنانچہ جنگ کی شروعات سے پہلے طارق نے مسلمان فوجوں کو حمد وثنا کے بعد جنگ اور جنگ کی اہمیت اور اس کے فوائد پر زوردار الفاظ میں روشنی ڈالی اور اس نے کہا تم لوگوں کی واپسی پر تمام راہیں مسدود ہیں، تمہیں تو خدا اور اس کی یکتائیت کو پھیلانا ہے، تمہیں، دشمنوں کی کثرت، تعداد سے گھبرانے کی ذرا ضرورت نہیں تم تو لو شیر خدا ہو تمہارے بازوں میں حیدر کرار اور خالد بن ولید کا جوش آمیز خون دوڑتا ہوا دیکھ رہا ہوں، اب وہ وقت آن پہنچا ہے، اپنے خون سے کفار کے لاتعداد فوجوں کے دلوں میں دہشت پیدا کر دو اور اپنی پامردی وجواں مردی کا لاثانی ثبوت پیش کر دو کہ آگے امت بھی تمہارے آج کے کردار وعمل کو دیکھ کر شرما جائیں اور آئندہ کی نسل و قوم تمہارے نقش قدم پر چلنے کے لیے آمادہ رہیں، ان بزدل قوم سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں "لاتحزن ان اللہ معنا" تمہیں تو اب اپنی جاں نثاری اور جواں مردی سے اندلس کے مغرور بادشاہ کے ڈکٹیٹرانہ غرور کو توڑنا ہے، ایسا نہ کرو، تمہیں دنیاوی عیش وعشرت کی چیزوں کو دکھا کر یا ان کی ادائیگی کا وعدہ کر کے حرص وطمع کے سفید اور جھوٹے وعدے میں پھانس نہ لے، اور تم نعمت ابدی اور لازوال انعام (شہادت) سے محروم ہو جاؤ، نکل پڑو! یا تو جام شہادت نوش ہی کر دو یا غازی بن کر اس رہتی دنیا میں تاحیات زندگی کے لمحات گذار دو، اندلس کی پاکیزہ سرزمین صدیوں سے تمہاری آمد کا انتظار کر رہی ہے، اب وہ وقت آن پڑا ہے، تم اپنے لہو سے ان صدیوں کی مرجھائی کیاریوں کو سینچ دو، اسی جذبۂ حقیقی کی طرف علامہ اقبال نے اپنی نظم "طارق کی دعا" میں بڑی خوبی کے ساتھ دلی کیفیات کا اظہار کیا ہے ؎

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا اور دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب ومقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

عرصۂ دراز سے عربوں کی خواہش بھی تھی، اندلس جیسی سلطنت میں اللہ کا پیغام پہنچا دیا جائے اور وہاں سے بربریت کے ناپاک اور سیاہ دھبے کو نیست ونابود کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے پیارے نبی کی د مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے طارق بن زیاد کو (حالت خواب) اندلس کی طرف جانے اور وہاں پر پیام حق پہنچانے کا حکم دیا، اس خواب سے طارق بیدار ہوتا ہے ادھر موسیٰ بن نصیر کا ظاہری آلۂ کارزار کی فراہمی اور ادھر سے فتحمندی کی بشارت پاکر اندلس کی طرف صحرا پھلانگنے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے ——— طارق اور ان کی فوجوں میں اگر کوئی نشہ تھا تو وہ صرف یکتائیت کا تھا اس نشہ نے ان میں جوش، ولولہ، امنگ اور ترنگ، دوام وثبات، ہمت وجرأت پیدا کر دیا، ان میں ایک نئی قدرتی طاقت نمودار ہو رہی تھی ان میں "اعتصموا بحبل اللہ جمیعا" کی عظیم خوبی جاگزیں ہو گئی تھی، وہ اپنی اپنی موت کو حیات پر ترجیح دینے لگے تھے، ان کے دل پختہ ارادہ جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو رہے تھے وہ جدھر جاتے فتح اور کامرانی ان کے قدم چومتی اسی کی طرف سر اقبال کا اشارہ ہے۔ ؎

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

بالآخر دونوں طرف کی فوجوں میں گھمسان کی معرکہ آرائی ہوئی اور مسلمانوں کی مختصر فوج نے جان کی بازی لگا کر فتح حاصل کی، مگر اس وقت مختلف ریاستوں کی فوجیں گورنر بھی آمادۂ کارزار تھے، طارق نے اپنی شجاعانہ چابکدستی سے کام لے کر ان جابر اور قاہر حاکموں کے چھکے چھڑا دیئے ان ہی صوبوں میں ایک صوبہ قرطبہ بھی ہے۔

فتح قرطبہ:

چونکہ اسی اثنا میں طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر والی افریقہ کے مابین کچھ سیاسی رجحان میں مخالفت ہو گئی تھی جس کی بنا پر موسیٰ نے ایک تجربہ کار غلام "مغیث" کی سرگردگی میں قرطبہ کی طرف، سو سواروں کا ایک دستہ روانہ کیا، مغیث نے اپنی فوجی سوجھ بوجھ سے قرطبہ جیسے مضبوط اور مستحکم قلعہ کو فتح کر لیا اور وہاں پر مکمل طور سے مسلمانوں کا اقتدار جم گیا، قرطبہ پر اسلامی ظفر ماہ شوال ۹۲ھ مطابق ماہ اگست ۷۱۱ء ہوا، اور محرم ۹۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ونومبر ۷۱۱ء سے وہ اسلامی شہروں میں شمار کیا گیا

مسجد قرطبہ کے مخصوص صفات:

قرطبہ اندلس کا بہت ہی حسین اور لالہ زار شہر ہے، جہاں پندرہ ہزار مکان اور شاہی کارخانہ جات تھے، تقریباً ایک لاکھ مکان رعایا کے تھے، جن میں دس لاکھ سے زائد زندگی گذارتے تھے، سات سو مسجد اور نو سو حمام تھے جن کو صیہونیوں نے مسمار کر دیا اب قرآن کے نشانات بھی مٹ گئے ہیں، صرف جامع مسجد باقی ہے، جس کی نظیر دنیا بھر میں نہیں ہے، ۱۷۰ھ میں عبدالرحمٰن نے اس کی بنیاد ڈالی تھی اس کے بعد اس کے فرزند نے ۱۹۳ھ میں تمام کی، اسلامی حکومت کے مدت اختتام تک ہر وہ بادشاہ جو وہاں کا تخت نشین ہوا اس کی عمارت میں حسن کاری اور مینا کاری کرتا گیا، مثلاً ایک نے دروازہ اور ستونوں کو سنہرے رنگ میں آراستہ کیا، دوسرے نے دو سو بیالیس فٹ کا بلند مینارہ تعمیر کیا، تیسرے نے چھت پر ایک مزید درجہ بنوایا، چوتھے نے شرقی اور غربی جانب انیس اور جنوبی وشمالی طرف آٹھ آٹھ دیوان گنبددار بنوائے، اور اکیس زینے کے مشبک اور منقش دروازے بنوائے تھے، جن پر سونے کی آمد ورفت کرتے تھے اور جملہ ابواب پر چہار سمت حصار مسجد میں منتشر ہیں اس مسجد کی چھت ۵ سو ۷۰ فٹ لمبی اور ۳ سو ۸۰ فٹ چوڑی اور بارہ سو ترانوے ایک ڈال ڈالا ستون جو سنہرا ہے نصب کیا گیا ہے، دیواروں میں پچکاری کا کام رنگین پتھروں سے حسین اور عمدہ کاریگری کی ہے، گویا کہ وہ موئے قلم سے منقوش معلوم ہوتی ہیں، منبر مسجد عاج اور ایک عمدہ بیش قیمت لکڑی سے بنایا گیا ہے، پورا منبر جواہرات سے مرصع ہے، صحن مسجد میں چار حوض ہیں جو پانی سے لبریز رہتے ہیں، ہر حوض پر ۸۰ ستون پر قائم کیے گئے ہیں، جن پر چھت بنوائی گئی ہے، اس پر ۵ فٹ مٹی ڈال کر چمن بنایا گیا ہے، مسجد کے بلند و غربی جانب سے شرقی جانب تک اٹھائیس دالان ہے، ہر دالان نو نو در کا ہے، بہت وسیع ہے گویا ہر دالان مدرسۃ العلوم ہے، ایک سو قندیلیں برنجی، چار ہزار سات سو فانوس طلائی لٹکائے گئے ہیں، بہرحال اس مسجد کی عمارت اب جس حالت پر قائم ہے اس کو دیکھ کر مختلف مقامات کے سیاح محو حیرت ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں اور دانشمند چشم عبرت سے مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرف علامہ اقبال شاعر مشرق نے بال جبرئیل میں اشارہ کیا ہے بلکہ مسجد قرطبہ کے عنوان سے ایک بڑی نظم لکھی ہے، جبکہ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں اندلس جا کر خصوصاً اس تاریخی مسجد کی زیارت کی اور نماز بھی پڑھی تھی تو اس عظیم مسجد کی ساخت اور بناوٹ اور اس کی جملہ مینا کاری اور حسن کاری کو دیکھ کر مسلمانوں کی عظمت شان اور علو مرتبت ان کے دل ودماغ پر چھا گئے تھے، اور بے ساختہ مسجد قرطبہ کے نام سے نظم لکھی، ان کے والہانہ محبت پر غور کیجیے ؎

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت وبود
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود

یہی وہ جگہ ہے جہاں پر دنیا کے دور دراز حصوں کے شوقین اور علم کے پیاسے طالب علم عروض، الٰہیات، قانون، طبعیات، حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، فلسفہ اور دیگر علوم کی تحصیل کے لیے آیا کرتے تھے، اسی کے مدرسۃ العلوم سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے، نیز تصوف کی راہیں طے کر کے منزل مقصود پاتے تھے وہیں سے مجاہد اسلام اور رہبر قوم وملت بنتے تھے جنھیں دیکھ کر فرشتہ بھی شرما جاتے تھے، شاعر اقبال نے صاف صاف الفاظ میں کہا ہے :-

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز وگدازِ سجود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ وپے میں ہے

جب اموی حکمرانوں کا دور دورہ ختم ہوا ——— اور عباسیوں کا عہد شروع ہوا تو عباسیوں نے اموی خاندان کا اہم فرد جس کا نام عبدالرحمٰن ہے، بڑی ہی مشکل سے بھاگ نکلا اور دریائے دجلہ کے کنارے کی ایک بستی میں جا کر پناہ لی، جہاں پہ ان کے خاندانی افراد رہا کرتے تھے، عبدالرحمٰن الداخل نے وہاں سے بھی کوچ کیا اور دریا عبور کر کے افریقہ کی راہ لی اور وہاں سے اندلس کے بارے میں برابر سوچتا رہا، اور چونکہ اموی خون ان کی رگ وپے میں موجیں مار رہا تھا اندلس کے حصول کی تمام راہیں کرتا رہا، چنانچہ انھوں نے ۱۳۸ھ میں اپنی آبائی حکومت کا عنان ہاتھ میں لیا، اور قرطبہ کو اندلس کا پایۂ تخت قرار دیکر مسلسل ۳۴ سال تک عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا یہی وہ شخصیت ہے جس نے مسجد قرطبہ کی بنیاد ڈالی، اور یہ مسجد ان ہی کے زمانے میں ایک طور سے مکمل ہو چکی تھی مگر پھر بھی بہت سے کام باقی تھے جب ان کے پوتے اندلس کے پایۂ تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو انھوں نے اپنے دادا کے خواب حقیقی کی تعبیر کو حقیقت کا روپ دیا یعنی اس مسجد عظیم کی مزید تعمیر وترقی اور اضافہ میں جان کی بازی لگا دی بہرحال مسجد میں جو فراہم ہو سکی تھیں فراہم کیں، جن کا تذکرہ مذکورہ بالا صفحات میں گذر چکا ہے۔

عبدالرحمٰن سوم کا نام روشن ہے کہ انھوں نے اس تاریخی مسجد کو حقیقتاً مسجد کا روپ دیا تھا جس ذیل کی عبارت سے معلوم ہو گی۔

"مسجد قرطبہ کی حیثیت کذائی اس طریقہ پر تھی کہ عیسائیوں نے آدھے حصہ کو گرجا گھر بنا لیا تھا اور آدھے حصہ میں مسجد تھی، جب مسلمانوں کا اقتدار اندلس پر جم گیا اور قرطبہ دارالسلطنت بن گیا تو عبدالرحمٰن اور ان کے عمائدین نے سوچا کہ اس مسجد کی تعمیر اس طریقہ پر ہو کہ باقیماندہ حصہ جس میں کلیسا ہے مسجد میں شامل ہو جائے مگر معاہدہ میں صاف تصریح تھی کہ مسلمان کلیسا والے حصہ کو نہیں لے سکتے تھے عبدالرحمٰن نے قیمتاً لینے کی تجویز عیسائیوں کے اکابر اور معززین کے سامنے پیش کی تھی مگر عیسائیوں نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے سارے پروگرام بیکار ہو گیا تھا لیکن عمائدین قوم نے ہمت نہیں ہاری بلکہ بڑے ہی غور وخوض کے بعد ایک نئی تجویز سوجھی اور وہ یہ کہ عیسائیوں کے مسمار شدہ کلیساؤں کو از سر نو بنانے کی اجازت دے دی جائے اور کوئی بھی قیمت دے کر آدھا حصہ جو مسجد کا گرجا میں تبدیل ہے اس کو لے لیا جائے، چنانچہ یہی تجویز پیش کی گئی بالآخر عیسائیوں نے یہ تجویز بخوشی مان لی۔

جب عیسائیوں نے اپنی رضامندی کا اظہار خیال کیا تو مسلمانوں کی خوشی کا یہ عالم تھا جس کا اظہار الفاظ کے جامہ میں نہیں کیا جا سکتا ہے ممکن ہے کہ انھیں اتنی خوشیاں دنیا کے کسی اور چیز کے حصول میں نہیں ہوئیں جتنی کہ اس نصف حصہ کے حاصل کرنے میں ہوئی تھی، اس خوشی کا اندازہ قارئین کو اس مسجد کی عمارت کی منبر، مینا کاری، مختلف قسم کے دالان اور نو قسم کے حوض اور ہر طرح کی سجاوٹوں کا پورا پورا انتظام سے ہوا ہو گا کہ ان کے اندر جذبہ مسلمانی اور کمال کتنا تھا جس کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے، در اصل ان مسلمانوں میں عشق خدا اور عشق رسول کا والہانہ جذبہ ان کے دل ودماغ میں مضمر تھا جس کا اظہار انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا ہے ان ہی جذبات میں سے ایک جذبہ جامع مسجد کی شاندار عمارت ہے یہی وجہ ہے کہ اسی کی تعمیر سے روح خدا بھی بن گئے ہیں ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ہے ؎

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

یہ ارادہ ۱۷۰ھ مطابق ۷۸۶ء میں حاصل ہوئی تھی، مسلسل دو سال کی مدت میں اس عمارت نہایت خوبصورت اور عالی شان مسجد کی شکل میں تبدیل ہو گئی، اس تعمیر میں اسی ہزار دینار صرف ہوئے تھے، جامع مسجد کی تعمیر عبدالرحمٰن کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی، عبدالرحمٰن نے اس کے منبر پر خطبہ دیا اور نماز جمعہ ادا کی۔

عبدالرحمٰن الداخل صاحب علم وکمال تھا، ادب وشعر کا صحیح ذوق رکھتا تھا، وہ خالص مشرقی تھا، اس کے دربار میں علماء فضلاء اور شعراء کا جمگھٹ لگا رہتا تھا چنانچہ وہ شعراء کا بڑا قدرداں تھا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ دور دور سے اس کے دربار میں اہل قرطبہ دانشور، اہل کمال آیا کرتے تھے اور اس کے شیریں بیان اور اس کے فصاحت کلام اور بلاغت سے محظوظ ہوا کرتے تھے، ہر طرف اس کی شعری خدمات، خوش گفتاری، اور داد ودہش کا چرچا تھا، ابوالمخشی شاعر اندلس ہمہ دم اس کے دامن سے وابستہ رہتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں تعمیر وترقی کا کام وسیع پیمانے پر ہوا۔

قرطبہ دانشوروں کا گہوارہ

ابوالمخشی کا نام سرفہرست ہے، ان میں شیخ غازی بن قیس بھی تھا، اندلس میں علم دین کا رکن اعظم تھا، علم کے تحصیل کنندگان شمع پروانہ کی طرح اس کے پاس جمع رہتے، اس زمانے کے ائمہ فن تھے، امام مالک، نافع بن نعیم، اور امام اوزاعی ابن جریج وغیرہ سے مختلف علوم کی تحصیلات کیں، اس کی درسگاہ قرطبہ ہی میں تھی، اسی نے موطا شریف وہاں پہ داخل کیا، اور نافع کی قرأت عام کی، علم لغت، اور نحو میں کمال حاصل تھا، اس طرح شیخ ابو موسیٰ کی شخصیت بھی بہت جامع تھی اور شہرت پذیر تھی۔

عرصۂ دراز سے مسجد قرطبہ غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے اور اب بھی ہے لیکن حال میں وہاں کے حکمراں نے مسلمانوں کو نماز وغیرہ ادا کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

ذکری

ایڈیٹر: محمد یوسف اصلاحی

[illegible]

تعمیر حیات کی توسیع اشاعت میں حصہ لیجیے

خواتین سے ایک سوال

سوچو تمہارا قصور کتنا ہے — ؟

(منورما دیوان)

بڑی کہاوت ہے کہ چور کو نہیں، چور کی ماں کو پکڑو۔ میں اسی کہاوت سے اس طرح کہنا چاہوں گی کہ چور کے ساتھ چور کی ماں، بیوی، بہن اور بیٹی کو بھی سزا دیجئے۔ کیونکہ آج ہمارے ملک میں جتنی بھی اسمگلنگ ہو رہی ہے، اس کی ذمہ دار ہم عورتیں ہیں۔ ہندوستان میں جس پیمانے پر ذخیرہ اندوزی، رشوت اور بدعنوانی ہو رہی ہے، اس کی نصف سے زیادہ ذمہ دار ہم عورتیں ہیں۔ آپ لوگ شاید میری ان باتوں کو پڑھ کر چونک اٹھیں گے، لیکن یہ کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہمارا سماج ہر روز دوچار رہتا ہے۔

لاکھوں کی لاگت والی کوٹھیاں ہیں، ان کی بیویوں کے پاس ہیرے کے سیٹ ہیں، لیکن ایک ہمارے پتی ہیں کہ ایمانداری کا پٹہ گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ کتنی بار کہا کہ آج کے زمانے میں ایمانداری کا دوسرا نام بے وقوفی ہے۔ ایسا نہیں کم از کم لڑکیوں کے جہیز کا تو خیال کرو۔

"میں نے اپنے سمدھیانے سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہم تو بارات میں پورے چار سو آدمی لائیں گے، سرکاری آرڈر چاہے کتنے ہی آدمیوں کو کھلانے کا ہو — جیسا بھی چاہے انتظام کرو، ہمیں برادری میں ناک تو نہیں کٹوانی ہے۔ آخر ہم نے بھی تو اپنی بیٹی کی بارات میں پورے سات سو آدمیوں کو کھانا کھلایا تھا، لڑکے کو ولایت میں پڑھایا ہے، ہزاروں خرچ کیے ہیں۔"

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے نامی پریس سے طبع کرا کر "دفتر تعمیر حیات" ندوہ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
اڈیٹر: اسحاق جلیس ندوی
کتابت: جلال الدین و محمد عامر ٹونکی

مولانا احمد اللہ شاہ

طاؤس و رباب کے ماحول میں شمشیر و سنان کا علمبردار

(عبد الرحمٰن اورنگ آبادی۔ درجہ ہشتم عربی)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب مغلیہ دورِ حکومت کے آخری حکمراں بہادر شاہ ظفر برسرِ اقتدار تھے۔ انگریز تجارت کے بہانے ہندوستان میں داخل ہو چکے تھے اور یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو چلانے کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

دو ہفتے تامل ناڈ، کرناٹک اور مہاراشٹر کے چند دینی، تعلیمی اور علمی مراکز میں

پانچویں قسط

اسحٰق جلیس ندوی

△

سید والا جاہی سے واپسی ایسے وقت ہوئی جب النکار عبد الشکور آڈوٹوریم میں طلباء کے انعامی مقابلوں کے جلسے کا آغاز ہو چکا تھا، یہ جلسہ بڑا دلچسپ اور بعض اعتبار سے میرے لئے ایک نئی دریافت کا ذریعہ بنا۔ مثلاً حفظ قرآن مجید کا مقابلہ۔ اس مقابلہ میں حصہ لینے والے مدرسۂ باقیات الصالحات ویلور، جمالیہ عربک کالج مدراس، جامعہ دار السلام عمر آباد، مدرسۂ لطیفیہ ویلور اور دیگر کئی مدارس اور انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے وہ طلباء تھے... جو کلام الٰہی کے حافظ ہیں۔ مقابلے کی صورت یہ تھی کہ چار پانچ حفاظ کرام بحیثیت حکم یا ممتحن اسٹیج پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور ایک طالب علم کو بلایا جاتا ہے۔ حافظ صاحبان باری باری اس سے قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور مختلف آیتوں کو امتحاناً پوچھتے ہیں اور یہ اچانک ایسا سخت امتحان ہوتا ہے کہ جس میں اچھے خاصے باشعور و مشاق حواس باختہ ہو جائیں مگر نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کا یہ روشن شفاف و عیاں کرشمہ تھا کہ نو عمر بچے اس امتحان سے ہنستے ہنستے گذر رہے تھے، نہ بدحواسی نہ گھبراہٹ، ہر ایک پُر اعتماد۔ میں نے شمالی ہند یا اپنے علاقہ مہاراشٹر میں اس طرز کا مقابلہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس مقابلے سے اس حقیقت کا بھی ادراک اور ایک خوشگوار انکشاف ہوا کہ اس علاقہ میں حفظ قرآن مجید کا عام رجحان ہے، دوسرے یہ کہ قرآن مجید کو پڑھنے میں تجوید و قرأت کا بڑا اہتمام ہے۔ ہم دور سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جنوب میں صحیح تلاوت قرآن مجید کا اہتمام نہیں۔ اپنے اس خیال و تصور کی تردید حفظ قرآن کے اس مقابلے سے ہو رہی تھی، حفظ قرآن مجید کے علاوہ قرأت، اذان، تفسیر و حدیث کا تحریری امتحان بھی ہوا۔ مختلف مقابلوں کا یہ سلسلہ شام تک چلتا رہا۔ جج صاحبان نے نتائج تیار کئے، اور تقسیم انعامات کے سلسلے میں یہ اعلان ہوا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد تقسیم انعامات کی تقریب ہوگی۔ آج بھی عصر کے بعد تامل تقریر اور مغرب بعد راقم سطور کی اُردو زبان میں تقریر تھی۔

آج کے جلسے اور پورے دن کے مختلف پروگرام کی سربراہی عبد الرشید صاحب جنرل سکریٹری نیو کالج مدراس کر رہے تھے۔ عبد الرشید صاحب مشہور محترم تاجر النکار عبد الشکور صاحب کے فرزند ہیں جن کے عطیہ سے ان کے نام سے منسوب نیو کالج کا یہ وسیع و عریض خوبصورت و آراستہ آڈوٹوریم ہے جس میں اس وقت جلسہ ہو رہا تھا۔

جناب اے۔ اے۔ رشید ایم۔ اے سکریٹری مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن جنوبی ہند (جس کے زیر اہتمام نیو کالج مدراس ہے)۔ . . . عبد الصمد صاحب ایم۔ اے، ایم۔ پی کی طرح جواں سال اور فعال شخص ہیں۔

پروگرام کے مطابق عصر بعد جلسہ شروع ہوا، آج کے جلسے میں افتتاحی کلمات مرکزی نائب وزیر صحت مسٹر اسحاق نے فرمائے، یہ وزیر صاحب بنگال کے ہیں، عبد الصمد صاحب ایم۔ پی نے اسٹیج پر ہی مجھ سے یہ کہتے ہوئے تعارف کرایا، "آپ کے ہم نام مسٹر اسحاق نائب وزیر صحت حکومت ہند"۔ "ہم نام تھا"۔ تواضع سے ملے، اردو جانتے ہیں مگر تقریر انگریزی میں کی۔ ان کے بعد تامل تقریر ایک مسلمان متشرع بزرگ جناب پیر محمد صاحب (سابق ایم۔ ایل۔ اے) کی شروع ہوئی۔ آج کے تامل مقرر کی تقریر کل سے زیادہ مرصّع، جذباتی اور حق گوئی و بے باکی کا نمونہ تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و صورت میں اتباع کی دعوت دیتے ہوئے صاحب ریش مقرر نے بے ریش سامعین کی خبر لے ڈالی اور اسٹیج کے کلین شیو حضرات نے خندہ پیشانی سے ان کی اس تنقید کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ سراہا۔ شاید یہ مظاہرہ جنوب کے ساتھ مخصوص ہو ورنہ اس قسم کا وعظ و نصیحت کسی دوسرے علاقہ میں اچھی خاصی بدمزگی پیدا کر دے۔

آج تامل تقریر کے اہم نکات کا مفہوم عبد الرشید صاحب اور ڈاکٹر عزیز تمنائی ہر گوش گذار کرتے رہے۔

مغرب کی اذان سے قبل یہ نشست عبد الرشید صاحب صدر والا و منتظم جلسہ کے اس اعلان کے ساتھ ختم ہوئی کہ نماز مغرب کے فوراً بعد اسحاق جلیس ندوی تقریر کریں گے، ان کی تقریر کے لئے غیر محدود وقت دیا جاتا ہے، ان کی تقریر کے بعد انعامات تقسیم ہوں گے۔ سامعین نے "غیر محدود وقت" . . . کا بڑا استقبال کیا کیونکہ کل کی تقریر وقت کی تحدید میں تشنہ رہ گئی تھی۔

مغرب بعد جلسہ شروع ہوا تو ہال کی وسعتوں کو سامعین کی تعداد نے پُر کر دیا تھا کئی لوگوں کو باہر گیلری میں کھڑا رہنا پڑا، ہال کے ایک گوشے میں مستورات کے لئے پردہ کا اہتمام تھا۔ کل کے بنسبت آج حاضری بھی زیادہ تھی اور کمیت و کیفیت — Quality — and Quantity — میں آج کا جلسہ بڑھا ہوا تھا۔

آج کا جلسہ اور شب مدراس کی آخری شب اور آخری جلسہ تھا، صبح سویرے مجھے ویلور روانہ ہونا تھا، مدراس شہر سیرت کمیٹی کے ممبران نے ایک روز مزید قیام اور ان کے جلسے میں شرکت کا بڑا اصرار کیا تھا مگر میرے طے شدہ نظام اور پروگرام میں مزید قیام کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے تک تقریر کی اور اس احساس کے ساتھ کہ اہل مدراس سے آخری بار مخاطب ہوں۔ سامعین توجہ اور دلچسپی سے تقریر سنتے رہے، آخر میں عبد الصمد صاحب ایم۔ پی نے تامل زبان میں تقریر اور مقرر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایسے الفاظ میں کہ جسے اپنے بارے میں سُن کر میں اپنی جبیں پر عرق انفعال محسوس کر رہا تھا کسی شہ کی مصاحبی کی یہ برکت تھی۔ ع

"وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے"

آخر میں مختلف مقابلوں میں کامیاب طلباء کو نقد انعامات دئے گئے۔ انعامات کی رقم خاصی تھی، مجموعی طور پر کم و بیش پانچ ہزار روپے نقد انعام تقسیم کیا گیا۔ جنوب کے ایک جدید تعلیمی ادارے نیو کالج میں حفظ قرآن مجید، قرأت و تجوید، اذان و تفسیر و حدیث کے طلباء کی اس طرح ہمت افزائی اور قدر دانی ایک لائق تقلید مثال ہے۔ صدر جلسہ نے آخر میں اپنی سوسائٹی کے اس عزم و ارادہ کا بھی اعلان کیا کہ سال آئندہ ہم انشاء اللہ کل ہند مقابلے کا انعقاد کریں گے اور ۲۵ ہزار روپے نقد انعام دیں گے۔ خاصی تاخیر سے نماز عشاء ہوئی بعد میں اجتماعی کھانا ہوا۔ کئی حضرات سے تعارف ہوا۔ لوگوں نے بڑی گرم جوشی اور اپنائیت کا ثبوت دیا، ندوہ اور فضلائے ندوہ سے اپنے حسن ظن کا اظہار کیا۔ وہ تعلق کا اظہار کر رہے تھے مگر میرا یہ حال تھا کہ ؎

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

مدراس میں بعض ان علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں سے بھی ملاقات ہوئی جن سے غائبانہ تعارف تو تھا مگر صورت آشنا نہیں تھا۔ ان میں ڈاکٹر خلیفہ، ڈاکٹر عزیز تمنائی، سید ابو الحسنات ایم۔ اے بھی تھے۔ سید ابو الحسنات سے تو غائبانہ خط و کتابت بھی تھی، یہ جرنلسٹ ہیں، مدراس کے اردو روزنامہ "مسلمان" کے ادارتی عملے میں ہیں، تعمیر حیات میں بھی لکھتے ہیں، اور علمی شغف بھی رکھتے ہیں، میری مدراس آمد پر ان کے والد بزرگوار سید ابو البرکات انور صاحب نے (جو نابینا اور معمر بزرگ ہیں) چند اشعار کہے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان اشعار کو میں "تعمیر حیات" میں شائع کروں مگر مجھے یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ ان کے اصرار پر میں نے یہ وعدہ کیا کہ روداد سفر کے ضمن میں انہیں غیر نمایاں طور پر حکم کی تعمیل میں شائع کر دوں گا، درج ذیل قطعۂ تاریخ ایک بزرگ سے کئے ہوئے وعدے کا ایفا ہے اس سے اپنی پبلسٹی ہرگز مقصود نہیں ؎

بارک اللہ کہ وہ آگئے شہر مدراس\
ہیں جو عمران و سلیمان کے دم ساز و انیس\
مقصدِ زیست ہے جس قوم کی "تعمیر حیات"\
ان کے الفاظ ہیں پُرمغز، مضامین نفیس\
سر بہجت سے یہ انور نے کہا سال ورود\
رونق افروز ہیں مدراس میں اسحاق جلیس

۵ ۱۳ ۹ ۵ھ

ڈاکٹر عزیز تمنائی کی ذہانت، ادب نوازی اور خوش اخلاقی سے میں ایسا ہی متاثر ہوا جیسا ۱۹۵۹ء میں ان سے پہلی مرتبہ بنگلور اردو کے مشہور ادیب و تنقید نگار پروفیسر احتشام حسین مرحوم متاثر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر عزیز تمنائی عجیب و متضاد خصوصیات کے مالک ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے ایک کامیاب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر، صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ فعال سماجی کارکن ہیں صدر، اور ادبی ذوق ایسا نکھرا، شہزادہ بختہ کہ ڈاکٹری کے مشغول پیشہ کے ساتھ بھی وہ تازہ اور شاداب ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی انھیں شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی، پہلے مشاعروں کے لئے غزلیں لکھتے اور پڑھتے رہے۔ پھر ادبیات اور تنقید ادب کے مطالعہ نے نظم گوئی

کی طرف متوجہ کیا اور اقبال کے رنگ میں کہنے لگے۔ انگریزی ادب کے مطالعہ سے جدید شاعری کے بعض اسرار منکشف ہوئے اور ن۔ م۔ راشد، میراجی اور ان کے ہم عصروں کی آواز دل کو کھینچنے لگی، اس طرح سانیٹ لکھنے کی تحریک ہوئی۔

سانیٹ اغنائی داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس کی روایت قدیم اطالوی شعراء تک پہونچتی ہے۔ سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ چودہ مصرعوں کو ایسے دو بندوں میں تقسیم کیا جائے کہ اس کے پہلے آٹھ مصرعوں میں خیال کا پھیلاؤ ہو اور بعد کے چھ مصرعوں میں اس کی تکمیل۔ اس کا رواج پندرہویں صدی سے فرانس اور انگلستان میں ہوا۔

ویاٹ (WYAT) انگریزی کا پہلا شاعر تھا جس نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ویاٹ کے بعد سرے (SURREY) ڈرائیڈن (DRYDEN) اور پھر شیکسپیئر (SHAKES-PEARE) نے اس طرز سخن میں کمال حاصل کیا۔ اسپنسر (SPENCER) اس دور میں بابائے سانیٹ کہلاتا تھا اور سر فلپ سڈنی (SIR PHILIP SYDNEY) شہزادۂ سانیٹ۔ لیکن شیکسپیئر ان سب میں ایک ممتاز مقام کا مالک تھا۔ انگریزی میں سانیٹ کو ایک خاص رتبہ حاصل ہوا، چوٹی کے شعراء نے اس ہیئت پر عبور حاصل کرنا اپنے لئے باعث فخر و امتیاز سمجھا، ملٹن (MILTON) ورڈسورتھ (WORDSWORTH) کیٹس (KEATS) براؤننگ (BROUNING) میتھیو آرنلڈ (METHEW ARNOLD) روزیٹی (ROSETTI) — سوئن برن (SWIN BURNE) روپرٹ بروک (RUPERT BROOK) وغیرہ نے انگریزی سانیٹ کو فن کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

اُردو زبان میں اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں عظمت اللہ خاں، ن۔ م۔ راشد اور اختر شیرانی نے اس کی طرح ڈالی لیکن ان کے سانیٹ سند قبولیت عام حاصل نہ کر سکے اور انہوں نے اس صنف کو نظر انداز کر دیا۔

سانیٹ کا مفصل تعارف اور اس حقیقت کے ادراک کے بعد کہ کسی معروف شاعر نے اُردو میں سانیٹ نہیں لکھا، ڈاکٹر عزیز تمنائی کی اس صنف میں کامیاب کوشش اور ان کے سانیٹ کا مجموعہ "برگِ نوخیز" پڑھ کر ان کی جودت و جدت طبع کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز تمنائی مزاجاً و اخلاقاً ایک دین پسند انسان ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے سانیٹ میں اسلام کے آفاقی تصور، اخلاقی نظام اور تعمیری اقدار کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ مومن و مسلم شاعر اپنے مجموعۂ کلام کا آغاز حمد و نعت سے کرتا ہے۔ عزیز تمنائی کے مجموعۂ سانیٹ میں "حمد"، و "نعت" یہ عنوان تو نہیں لیکن وہ سب کچھ ہے جس کی توقع ایک مومن قلب و دماغ سے ہو سکتی ہے پہلی نظم "اعتراف" پڑھئے ؎

تیرے دربار میں پہونچا ہوں بڑی دیر کے بعد\
آستاں دیکھے بہت اونچے، بہت پاکیزہ\
کھینچ کر لے گئی مجھ کو کشش حسن و جمال\
محو نظارہ رہے قلب و نظر، خواب و خیال\
میکدہ، بت کدہ، آتشکدہ گھوم آیا ہوں\
سر حیرارض و سماوات کو چوم آیا ہوں\
تیرے در لوٹ کے آیا ہوں بڑی دیر کے بعد\
میری پیشانی تاباں ہے ابھی دوشیزہ

نغمہ و نور نے نکہت نے مجھے کھینچا تھا\
فکر نے، فن نے، فراست نے مجھے کھینچا تھا\
عصر حاضر کے تقاضوں نے مجھے دی ترغیب\
پھر بھی ہر لمحہ رہا میں تری یادوں کے قریب\
تیری رحمت کی جو ہو جائے نظر دیر نہیں\
کہتے ہیں تیرے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں

دوسرے سانیٹ کا عنوان ہے ... "توحید داری"

تاریکیوں کو طرۂ انوار بخش کر\
ہم دوش مہر و ماہ کیا، خار زار کو\
کی مرحمت شگفتگی و شانِ رنگ و بو\
ایسے نقوش کھینچے کہ قرطاس دہر پر\
نقش دوام بن گیا انسانیت کا نام\
روح چمن کو نعرۂ حق سے جھنجھوڑ کر\
اوراق گل کو سنگ اخوت میں جوڑ کر\
پیشانی چمن پہ رکھی مہر احترام

ہستی کو جس پہ ناز ہے وہ ہستی عظیم\
جس کا وجود باعث تخلیق کائنات\
جس سے حریم ذات میں ہے جلوۂ صفات\
وہ منتہا وہ منزل ہر راہ مستقیم\
اس حسن بے مثال کے اوصاف کیا کہوں\
خیر البشر کہوں، اسے خیر الوریٰ کہوں

۱۹۶۰ء کے اوائل میں دنیا کی چار عظیم طاقتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس) نے پیرس میں ایک چوٹی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا، اس کی ناکامی کے تاثرات عزیز تمنائی کے سانیٹ "چوٹی" میں ملاحظہ ہوں ؎

اِک ستارۂ آہنی دیوار اُبھر آتی ہے\
ہر قدم آگے جو بڑھتا ہے پلٹ آتا ہے\
کچھ نہ کچھ مد مقابل سر رہ پاتا ہے\
اک نہ اک پاؤں سے زنجیر لپٹ جاتی ہے\
پھر بھی بڑھتے رہے بڑھتے رہے چوٹی کی طرف\
گرد سے، دھند سے، کہرے سے بچا کر دامن\
تند شعلوں میں کئے مشعل دل کو روشن\
لے چلی امن کی آواز بلندی کی طرف

یہ بلندی نہ تھی اک وہم تھا اک دھوکا تھا\
عصر حاضر کے خداؤں کا نیا تازہ فسوں\
اک جہانگیر سراب، اک منظم شب خوں\
آدمیت کے گلے میں یہ نیا پھندا تھا\
جانے کب روشنی پھیلے گی افق کے اس پار\
جانے کب ٹوٹے گی فولاد کی اونچی دیوار

مجلس اقوام متحدہ کے اجلاس منعقدہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۶۰ء میں روس کے وزیر اعظم خروشچیف بھی شریک تھے، اس پس منظر میں عزیز تمنائی کا سانیٹ "گلچیں" ملاحظہ ہو ؎

یہ کون باغ کی کلیوں کو توڑنے آیا\
چمن میں پھونک رہا ہے ہوائیں زہریلی\
نظر ہے قہر میں ڈوبی، زبان نوکیلی\
ادا ادا میں ہے مکر و فریب کی چھایا\
لگا کے پھولوں پہ یہ تہمت خود آرائی\
چمن کے دوش پہ رکھ کر نئے نئے الزام\
بلند کر کے سر بزم پرچم دشنام\
کلی کلی کو پلاتا ہے جام تنہائی

زہے نصیب کہ کلیوں کو آگیا ہے شعور\
سفید و سرخ کے ہر امتیاز سے واقف\
یہ شرق و غرب کے اک ایک راز سے واقف\
سمجھ رہی ہیں بہت خوب فرق ظلمت و نور\
خزاں کا رنگ چمن کی فضا پہ چھا نہ سکا\
کماں سے تیر تو نکلا ہدف کو پا نہ سکا

ڈاکٹر ژواگو (Dr. Zhivago) کے مصنف روسی مصنف بورس پاسترناک (Boris-Pasternak) پر ایک سانیٹ، "پاسترناک" پڑھئے ؎

اک رند نے میخانے کے دستور سے ہٹ کر\
تعریف مئے ناب میں کچھ گیت سُنائے\
برسوں کے بھلائے ہوئے سب ساز بجائے\
پھر پردۂ فولاد کو آہستہ الٹ کر\
بیرونِ خرابات کے رندوں کو صدا دی\
"اے بادہ پرستو نہیں سب کچھ ہے میسّر"\
اور پیشِ نظر اپنے ہے زہراب کا ساغر\
اک عمر اسی جام کے سائے میں گنوا دی

بلبلی سی ہوئی میکدۂ شہر جنوں میں\
طوفانِ ملامت کبھی یلغار مذمت\
ہر طرح نکالی گئی اس رند کی میت\
وہ اپنی جگہ ڈٹ کے رہا حال زبوں میں\
سرخشت خرابات سے ہنستے ہوئے پھوڑا\
دم توڑا مگر دامن حق گوئی نہ چھوڑا

"برگ نوخیز" کے سانیٹوں میں جذبات اور محسوسات کا اظہار تخیل اور فکر کی آمیزش کے ساتھ ہوتا ہے، ان میں شاعر کے وہ خیالات اور افکار بھی ہیں جو اسے زندگی کے تجربات سے حاصل ہوئے ہیں، یہ خیالات فنی، سیاسی، ذاتی اور مفکرانہ ہر قسم ہیں۔ موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ اظہار میں بھی ایسی شگفتگی اور ایسا تنوع ہے جس سے یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ سارے مجموعے میں ہم چودہ چودہ مصرعوں کی نظمیں پڑھ رہے ہیں۔

عزیز تمنائی کے مجموعۂ سانیٹ "برگ نوخیز" کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ، "جہاں تک میں جانتا ہوں برگ نوخیز اردو سانیٹوں پر پہلا مجموعہ ہے جو شائع ہو رہا ہے اور یہ پہلا مجموعہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اردو کے فنکار نہ صرف اپنی زبان اور اپنے ادب کا دامن نت نئے پھولوں سے بھر رہے ہیں بلکہ ان پھولوں پر ریاض کر کے انھیں نئی آب و تاب اور نیا رنگ و آب بھی بخش رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عزیز تمنائی کی اس کوشش کو یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

پروفیسر احتشام مرحوم کی یہ خواہش میں سمجھتا ہوں کہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی۔ ادب کے اجارہ داروں نے ڈاکٹر عزیز تمنائی کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے ویسے بھی جنوب کی علمی، ادبی، سماجی حتی کہ دینی سرگرمیوں، کوششوں اور شخصیتوں کا شمال میں بہت کم تذکرہ ہوتا ہے، اعتراف و قدر افزائی کی منزل تو بہت دور کی بات ہے۔

کاکا محمد عمر صاحب، ڈاکٹر عزیز تمنائی، پروفیسر سید علی، پروفیسر عبد الحکیم اور دیگر کئی حضرات سے بے تکلف گفتگو نصف شب تک جاری رہی، تکان کا غلبہ تھا اور مجھے علی الصبح سفر کرنا تھا مگر اہل مدراس کی محبت و اپنائیت نے مجھے ان کے خاندان کا ایک فرد بنا دیا تھا اور اس خلوص نے ہر بوجھ کو ہلکا کر دیا تھا۔ نیو کالج میں دو روزہ قیام کے دوران ایک بات بہت محسوس ہوئی، جس کا ذکر میں نے وہاں کے ذمہ داروں سے بھی کیا وہ یہ کہ اردو زبان کے فروغ و اشاعت کے ایسے اچھے مواقع موجود

طلبائے دارالعلوم کی عربی انجمن "النادی العربی"

جائزہ ـــــ خدمات

(ابوسعد اعظمی، جنرل سکریٹری "النادی العربی")

ندوۃ العلماء کی فلک بوس عمارت جن انقلابی اور تجدیدی بنیادوں پر تعمیر کی گئی تھی، ان میں سے ایک عربی زبان و ادب سے ربط و تعلق اور اس میں کمال پیدا کرنا تھا۔ مدارس عربیہ کا نصاب ادب عربی بہت ہی کمزور تھا، اور جن کتابوں کو نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا تھا وہ از کار رفتہ اور مردہ زبان کے حاصل کرنے میں مددد سے سکتی تھیں، یا ئیں ندوہ نے ابتدا ہی سے زندہ اور شگفتہ زبان عربی پر توجہ کی، چنانچہ انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کا عربی زبان سے بھی گہرا ربط تھا، آپ کی ادارت میں عربی کا پہلا پرچہ "الضیاء" نکلا جس نے ندوہ کی بہترین ترجمانی کی، اور عالم عربی سے اس کا گہرا ربط قائم کیا، انھیں دنوں میں شیخ تقی الدین الہلالی کی یہاں آمد ہوئی جو کہ عربی زبان و ادب کے مستند عالم ہیں آپ کی آمد نے یہاں کے عربی زبان سے ربط رکھنے والے طلباء میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور ان کے آتش شوق کو بڑھا دیا، چنانچہ آپ کے ممتاز شاگردوں میں حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی اور ناظم ندوی ہیں جن سے دارالعلوم کی عربی زندگی کا ایک نیا آغاز ہوتا ہے۔

اب تک عربی کا ایسا کوئی نصاب نہ تھا جو ندوہ کے تخیل کا آئینہ دار ہوتا، اور جدید زبان و ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا یہ کام بھی ندوہ ہی کو کرنا تھا، چنانچہ حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی اور اساتذہ کی کوششوں سے ایک نیا نصاب عربی تیار ہوا جو کہ مدارس عربیہ بلکہ عصری درسگاہوں کے عربی شعبہ میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کی بیشتر کتابیں داخل نصاب تعلیم ہوئیں۔

انھیں دنوں میں یہاں عربی ادب کے اساتذہ کرام نے ایک نیا تجربہ کیا، اور ندوۃ العلماء خود ایک تجربہ ہی ہے خدا کا شکر ہے کہ یہ تجربہ کامیاب رہا، اردو زبان میں اس قسم کا ایک تجربہ پہلے کیا جا چکا تھا جس کی کامیابی "جمعیۃ الاصلاح" کی تھی، اور اس تجربہ کی کامیابی نے "النادی العربی" کی تشکیل کی۔ النادی العربی کے تحت طلباء میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے اور جدید عربی زبان سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے "الرائد" نکالا گیا، النادی العربی نے نشاط ادب کے لیے کام کیا، اور احاطہ ندوۃ العلماء میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اس جمعیت کے تحت مختلف شعبے قائم کیے گئے، اور خود طلباء ہی کو ان کا منتظم بنایا گیا، جو صدر النادی العربی حضرت مولانا رابع صاحب ندوی ادیب اول کی ہدایات کی روشنی میں سارے کام انجام دیتے ہیں، عربی میں ... صاحب ... [illegible]

مافی الضمیر کی صحیح طور پر ترجمانی کے لیے اللجنۃ الخطابیۃ قائم کی گئی ہے جس کے تحت ہر جمعرات کو درجوں میں طلبہ مقررہ عناوین پر تقریریں کرتے ہیں، اس بزم کا ایک ماہانہ جلسہ بھی ہوتا ہے، علمی و فکری صلاحیت کو جلا دینے کے لیے اللجنۃ الثقافیۃ قائم ہے، جس کے پندرہ روزہ جلسے ہوتے ہیں، اساتذہ کرام کی روشنی میں ایک طالب علم وقیع علمی مقالہ لکھتا ہے اور اس کو اراکین النادی العربی اور اساتذہ کرام کی موجودگی پیش کرتا ہے، مقالہ کی انتہا پر سنجیدہ علمی بحث ہوتی ہے، یہ دونوں بزمیں علی الترتیب حضرت مولانا سعید الرحمان صاحب ندوی ایڈیٹر البعث الاسلامی اور مولانا واضح رشید صاحب ندوی ایڈیٹر "الرائد" کی زیر سرپرستی چلتی ہیں، ان کی کامیابی نے آج ندوۃ العلماء کے احاطہ میں عربی ادب کا ذوق پیدا کر دیا ہے جو کہ یہاں کا خصوصی امتیاز ہے، دارالعلوم کا ربط عالم عربی سے گہرا ہے، عربی زبان و ادب کے مستند علماء و فضلاء اور عالم عرب کی علمی، سیاسی اور مذہبی شخصیتیں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں ایسے مواقع طلباء کے لیے نازک اور سنہرے ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں کو کس حسن و خوبی سے اور آنے والے ان مہمان کرام سے تبادلہ خیال کرتے اور ان کو اپنا پیغام پہنچاتے ہیں، اس کا اندازہ بھی سے لگایئے کہ ایک موقع اس وقت آیا جب کہ مصر کے مشہور اور ممتاز ادیب علی طنطاوی کا یہاں آنا ہوا، اراکین النادی العربی اور طلباء سے مل کر، ان کی بات چیت سن کر، اور ان کے پختہ و بلند خیالات سے واقف ہو کر موصوف کتنا خوش ہوئے اور یہاں کی عربی سرگرمیوں سے کتنا متاثر ہوئے، اس کو المسلمون فی الہند کے مقدمہ کو دیکھنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جب تک میں ندوہ میں رہا مجھے محسوس ہوتا رہا کہ میں عالم عرب کے کسی جزیرہ میں ہوں۔

جس وقت تک کہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں یہ پرچہ پہنچے گا اس وقت تک النادی العربی کے انعامی مقابلے ختم ہو چکے ہوں گے، یوں تو اس قسم کے پروگرام بہت ہوتے ہیں، لیکن النادی العربی علم انعامی پروگرام کی جدت اور دلکشی اور ہی ہے، ایک نیا انداز جنون ہے اور ندوہ کے طلباء نے بارہا اس جنون میں تلاش آذری کیا ہے، ہال اساتذہ کرام و طلباء سے بھرا ہوتا ہے، اشعار ایک ہی مواقع پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اس وقت جلسہ کا آغاز ہے چند منٹ قبل انھیں عناوین دیئے جاتے ہیں، اس طرح انھیں چند منٹ میں تیار ہو کر وہ اپنے افکار و خیالات شستہ عربی زبان میں پیش کرتے ہیں جو کہ ان کی علمی گہرائی و گیرائی، اعتدال و توازن اور عربی زبان پر عمدہ قدرت کا نمونہ ہوتے ہیں۔

ذیل میں ہم النادی العربی کے مختلف شعبے اور اراکین کے نام پیش کرتے ہیں۔

اللجنۃ الخطابیۃ، سکریٹری، ابوسعد الاعظمی، شفیق اللہ
اللجنۃ الثقافیۃ، ،، امین عثمانی، سعید احمد بستوی
اللجنۃ الصحافیۃ، ،، عمیر الصدیق دریابادی
اللجنۃ الاداریۃ، ،، شفیق احمد الاعظمی
مکتبۃ الرائد، ،، رضوان احمد، منظور احمد

النادی العربی کے تحت ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی جو کہ اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے قائم کیا گیا ہے، ان کے علاوہ ہفتہ وار جلسوں کی مختلف درجات میں کارروائی چلانے کے لیے سکریٹری ہیں، جن کے نام مع دیگر اراکین کے یہ ہیں۔

سید سلمان الحسنی، علی احمد، محمد یونس
گلاب حسین، النسیم صدیقی، محمد معاذ
شمیم احمد، نسیم اختر، وسیم الدین

اس وقت عربی ادب کے میدان میں ندوۃ العلماء نے جو ترقی کی ہے اس کے بام و در پر فضاؤں میں جو ادبی ذوق پروان چڑھا جس کے موافقین و مخالفین دونوں کو اقرار ہے وہ سب دین ہے یہاں کے سرپرستوں کی توجہ، اساتذہ کرام کی کوششوں اور النادی العربی کی کامیابی کا۔

حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے چند اقوال

(انتخاب: محمد عطاء اللہ بیانی ہردوئی)

حضرت بنی نوع انسان میں قوت عملی پیدا کرنے کے لیے فرماتے ہیں۔

"اپنا کام لوگوں کی سرد باتوں سے ترک نہیں کرنا چاہیئے"۔ عوام میں حوصلہ پیدا کرنے کے لیے آپ کا ارشاد ہے "نامردی کا دن مردوں کی شب معراج ہے"۔

عوام کی بے عملی و تن آسانی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں "دنیا میں طفیلی بن کر رہنے کی خواہش کمزوری کی علامت ہے"۔

ظاہرداری اور بناوٹ سے لوگوں کو بچانے کے لیے آپ کا ارشاد ہے۔

"جیسا تو ہے ویسا ہی لوگوں کو دکھا ورنہ اصلیت خود بخود کھل جائے گی"۔

— حضرت بابا کے چند مختصر مگر نہایت قیمتی اقوال —

"ہر شخص کی روٹی نہ کھا مگر ہر شخص کو اپنی روٹی کھلا"۔
"احمق کو زندہ مت سمجھو"۔
"وہ فروخت نہ کر جو خریدی نہ جا سکے"۔
"آرائش کے پیچھے نہ پڑ"۔ "اوچھا پن نہ کر"۔
"جو تجھ سے ڈرتا ہے اس سے ہر وقت اندیشہ کر"۔
"دروغ راستی کو ترک کر دو"۔
"عاقل نما نادان سے پرہیز کرو"۔
"دولتمندوں کے پاس بیٹھ کر دین کو نہ بھولو"۔
"اندرونی حالت کو بیرونی حالت سے بہتر رکھنا چاہیئے"۔

(ایم۔ ایچ۔ رحمن ندوی۔ ہیڈ مولوی مدرسہ حسیہ اسلامیہ مربا، پورنیہ (بہار))

حُسنِ اخلاق کا کرشمہ

اس امت مرحومہ میں ہر دور اور ہر زمانہ میں کچھ ایسے افراد اور رہنما بکثرت پیدا ہوئے جنہوں نے امت کی اصلاح کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور اپنی صحیح نیت، حسن عمل اور حسن اخلاق سے ایسے اصلاحی کارنامے نمایاں انجام دئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ ایسے ہی خوش قسمت افراد میں ایک ایسا نام نامی ہے جس کو دنیا حضرت جنید بغدادیؒ کے نام سے جانتی ہے، جن کے پند و نصائح، ارشادات عالیہ، حسن عمل اور حسن اخلاق سے دنیا ہمیشہ فیضیاب ہوتی رہی ہے۔

شہر بغداد جو علوم و فنون کا مرکز، تالیف و تصنیف، تحقیق و تدقیق کا گہوارہ اور علوم نبوت کا سرچشمہ رہ چکا ہے اور علماء و فضلاء اور عارفین کے قیام سے منور، اور قال اللہ و قال الرسول کی آوازوں اور صداؤں سے شہر بغداد کی در و دیواریں گونج رہی تھیں، وہیں پر ایک ایسا بچہ بھی پروان چڑھ رہا تھا جو آگے چل کر اپنے ظلم و استبداد، لوٹ مار اور سفاکی و بربریت کی وجہ سے ڈاکو ابن ساباط کے نام سے مشہور ہوا۔

لوگ ابن ساباط کے ڈر اور خوف سے کانپتے اور ہمیشہ وحشت زدہ اور لرزہ براندام رہتے تھے۔ لوٹ کھسوٹ اس کا رات دن کا مشغلہ بن گیا تھا۔ بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کی ایک بڑی جماعت اس کے اشارہ پر چلتی تھی، حکومت بغداد نے کئی بار اسے گرفتار کر کے سخت سے سخت سزائیں دیں، حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک جرم کے ارتکاب میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا، اسی وجہ سے شہر بغداد کے لوگ اسے "ٹنڈا شیطان" کہتے تھے اور وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا، مگر وہ اپنے جرائم سے باز نہ آیا، اس کے جرائم اور بربریت سے عاجز آکر حکومت بغداد نے اسے گرفتار کر کے عمر قید کی سزا تجویز کر کے ہمیشہ کے لئے جیل خانہ میں ٹھونس دیا لیکن وہ گھٹا ٹوپ اندھیری راتوں، تاریک قید خانوں اور آہنی سلاخوں میں رہ کر راہ فرار کی ترکیبیں اور تدبیریں سوچنے لگا، آخر ایک وہ دن آہی گیا جب کہ وہ دس سال قید کی زندگی گزار کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن شیطانی خصلت اور عادت بد سے مجبور ہو کر اسی روز رات کو ایک مکان میں چوری کرنے کی غرض سے گھس گیا، مکان میں داخل ہونے کے بعد چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا کہ وہاں نہ دولت تھی نہ قیمتی مال، نہ اشرفیاں اور نہ ہیرے جواہرات، البتہ مکان کے ایک کونے میں کپڑے کے کچھ تھان بکھرے پڑے تھے، وہی جمع کرنے اور سمیٹنے شروع کئے، بقول شیخ سعدیؒ "چندانکہ بیشتر جست کمتر یافت"۔

ابھی وہ کپڑے کے تھانوں کو سمیٹ کر گٹھریاں باندھ ہی رہا تھا کہ اسی درمیان تاریک رات میں ایک نو وارد، اجنبی ایک لمبا سا جبہ پہنے اور ہاتھ میں شمع لے کر مکان میں داخل ہوا، پہلی ہی نظر میں ابن ساباط کچھ ٹھٹھکا اور پھر سنبھل کر اس سے مخاطب ہو کر بولا، تم کون ہو؟ اجنبی نے بڑی سنجیدگی اور اطمینان سے جواب دیا "گھبراؤ نہیں میں بھی تمہارا بھائی ہوں، مجھے یہ دیکھ کر بڑی تکلیف اور ملال خاطر ہوا کہ تمہیں اندھیرے میں چیزوں اور سامانوں کی تلاش و جستجو میں سخت ٹھوکریں کھانی پڑیں، اس لئے میں تمہارے لئے یہ شمع لایا ہوں، اب تم آرام اور اطمینان سے اپنا کام کرو، تمہارے چہرہ سے تھکاوٹ و پریشانی کے آثار نمایاں ہیں یہ تمہارے لئے دودھ کا پیالہ بھی ہمراہ لایا ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر ابن ساباط کو پہلے جھجکا پھر ہمت کر کے پیالہ لے کر غٹاغٹ پی گیا اور مستی میں آکر بولا، ارے بھائی معلوم ہوتا ہے تم بھی میری طرح چور ہو اور اپنی قسمت آزمانے یہاں آئے ہو۔

اجنبی نے کہا جو تمہارا جی چاہے سمجھ لو مگر اب ہم لوگوں کو جلدی کرنا چاہیے اور سرعت کے ساتھ اپنا کام ختم کرنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ صبح کی کرن پھوٹ پڑے اور لوگ ہمیں پکڑ لیں، اور مفت میں پابہ زنجیر ہو کر جیل خانہ جانا پڑے۔ ابن ساباط نے کہا بھائی دیکھو یہ دو گٹھریاں تیار ہیں، ایک بڑی اور ایک چھوٹی، چونکہ یہ میری ہی محنت کا ثمرہ ہے اس لئے دراصل یہ سارا مال میرا ہے اور میں ہی اس کا حقدار ہوں۔ کیونکہ پہلے میں ہی یہاں آیا ہوں، لیکن تم بڑے دلیر اور بہادر آدمی معلوم ہوتے ہو، اس لئے چھوٹی گٹھری تمہیں دیتا ہوں، وہ تم اٹھا لو تاکہ تم یہاں سے محروم نہ ہو جاؤ، اور بڑی گٹھری میں اٹھا لوں گا، اجنبی نے کہا، وہ تم ایک ہاتھ سے کیونکر اٹھاؤ گے یہ تم ہلکی گٹھری اٹھا لو اور میں تمہاری خاطر بڑی گٹھریاں اٹھاؤں گا، انہوں نے گٹھریاں اٹھائیں اور دونوں وہاں سے چلتے بنے۔

اجنبی ایک معمر ضعیف اور بوڑھا آدمی تھا اس لئے اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھتے تھے ابن ساباط گھبرا بھی رہا تھا چونکہ صبح ہونے کی فکر دامن گیر تھی، دل میں سوچا رات ختم ہونے والی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح ہو جائے اور یہ بوڑھا آدمی مجھے پکڑوا دے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تو خود بچ نکلے گا ہی مجھے بھی مروا دیگا۔ ابن ساباط کے قدم تو برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ ہی رہے تھے ساتھ ساتھ اس نے بوڑھے آدمی کو تیز رفتاری کے ساتھ چلنے کے لئے کہا اور مغلظات و سب و شتم اور لعنت و ملامت کی بوچھار اور زد و کوب شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ابن ساباط نے کہا لو یہی منزل مقصود پر آ گیا اور یہی میرا گھر ہے اب تم اپنی گٹھری اٹھا کر تیزی کے ساتھ اپنے گھر کا راستہ ناپو، اس وقت اجنبی نے بڑے اطمینان و سنجیدگی اور نرمی سے کہا، مجھے یہ گٹھری نہیں چاہیئے اور نہ مجھے اس کی احتیاج اور ضرورت ہے، یہ بھی تمہارا حق ہے، البتہ تمہیں ایک زبردست غلط فہمی ہو گئی ہے، مناسب معلوم ہوا کہ جس غلط فہمی کا تم شکار ہو گئے ہو وہ چلتے چلاتے دور کر دوں، حقیقت یہ ہے کہ جس مکان میں تم سے تم نے یہ مال اٹھایا تھا وہ میرا ہے، میں نے تمہاری خاطر یہ سب کیا تاکہ تمہیں تکلیف نہ ہو کیونکہ تم میرے مہمان تھے اور میزبان پر مہمان کی مہمان نوازی ایک اخلاقی فریضہ ہے، اس لئے میں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا، اب رخصت ہونے سے پہلے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور یہی میری آخری نصیحت ہے اس کو ہمیشہ یاد رکھنا، جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلف میرے مکان پر آ جانا وہ گھر تمہارا ہی ہے۔

ایسے ہی مراتب اوصاف اور صاحب کمال اور بلند ہستیوں کی تعریف اور شان میں شیخ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا
دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

اجنبی یہ آخری کلمہ کہہ کر رخصت ہو گیا، لیکن ابن ساباط ششدر اور مبہوت ہو کر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اف! یہ کیا معاملہ اور کیا راز ہے یہ گھر کا مالک ہے، کیا اس پر فریب دنیا میں ایسے نیک لوگ بھی ہوتے ہیں، میں نے اس کا مال و اسباب لیا، اسے سب و شتم، لعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنایا اور زد و کوب بھی کیا مگر حیرت ہے کہ اس بندۂ خدا، نیک دل انسان نے اف تک نہ کیا، بلکہ میری ناز یبا حرکتوں اور ناقابل معافی جرائم کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا گیا اور صبر و استقلال کا دامن تھامے رہا اور میں کتنا کمینہ اور ذلیل و خوار انسان ہوں، مخلوق خدا کو ناحق پریشان کرتا ہوں اور ہمیشہ درپے آزار رہتا ہوں، یہ کتنا نیک دل شخص ہے کہ ستانے والے کو بھی کچھ نہیں کہتا۔

وہ اپنے کئے پر بہت پچھتایا اور بہت زیادہ پشیمان اور نادم ہوا کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی میں اس سے جا کر ضرور ملوں گا اور تلافی مافات کی سعی کروں گا۔

یہ کہہ کر ابن ساباط شہر بغداد کو فوراً روانہ ہو گیا اور ٹھیک اسی مکان پر پہنچ کر لوگوں سے دریافت کیا کہ یہاں کپڑے کا کوئی تاجر اور سوداگر رہتا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہاں کوئی سوداگر رہتا ہے اور نہ تاجر تمہیں معلوم نہیں یہاں تو ہمارے بڑے جلیل القدر مرشد اور بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ رہتے ہیں، ابن ساباط کے کان حضرت جنید بغدادیؒ کے نام نامی سے آشنا تھے، وہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے جلیل القدر ولی اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ ہیں، یہ بات سنتے ہی اس کی گردن ندامت سے جھک گئی وہ اندر گیا، دیکھا کہ حقیقت میں وہی سوداگر نہیں حضرت جنید بغدادیؒ ہی ہیں۔

ابن ساباط اپنے گناہوں کو یاد کر کے زار زار رونے لگا اور بڑے ادب و احترام اور عقیدت و معذرت سے کہا، حضور مجھ نادان سے بڑی غلطی سرزد ہوئی مجھے معاف کیجئے، حضرت جنید بغدادیؒ نے ... [illegible] ... اپنے سینے سے لگا لیا اور ... [illegible] ... محبت سے دلاسا دیا اور فرمایا ... [illegible] ... جاتی ہے۔ اس کے بعد ابن ساباط ... [illegible] ... بدل گئی وہ نیک آدمی بن گیا ... [illegible] ... حضرت جنید بغدادیؒ کے مقبول مسترشد کی حیثیت سے مشہور ہو گیا ... [illegible] ... حضرت جنید بغدادیؒ کا نام آتا ہے اس کے ساتھ ابن ساباط کا نام بھی ... [illegible] ... پیرو مرشد کا نام روشن ... [illegible] ... کی حیثیت سے ... [illegible] ... یہ ... [illegible] ... ایک خدا رسیدہ فقیر کے لازوال ... [illegible] ... زندۂ جاوید ...

وہ رات کبھی نہ بھولے گی

(طلبائے ندوہ کی یونین جمعیۃ الاصلاح کے شعبۂ بزم خطابت و بزم سلیمانی کے سالانہ انعامی جلسوں کا رپورتاژ)

(عمیر الصدیق دریابادی ناظم انجمن الاصلاح)

وہ رات کبھی نہ بھولے گی

جگمگاتی برقی روشنیاں، نوری فوارے، گلاب، موگرے کے شاداب، مہکتے پھول، رنگ ہی رنگ، خوشبو ہی خوشبو، ولولہ اور جوش سے لبریز چہرے، زندگی ہی زندگی، امید و بیم، رجا و توقع سے بھرپور دل، اضطراب ہی اضطراب، معاملہ ساز کا سارا دل کے ہاتھوں میں، دھڑکن ہی دھڑکن۔

نور، رنگ، خوشبو، دمکتے چہرے، بے چین دل، امید اور توقع، اور پھر درمیان میں ماسٹر محمد مسیح صاحب صدیقی شیخ ندوہ، ندوہ جیسے اپنے سارے معانی، سارے مطالب، ساری تشریح کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

ندوہ کے خاص تذکرے کبھی کے بارے میں اگر سوال کیا جائے تو جواب میں اس کے علاوہ اور کیا عرض کیا جائے گا کہ رنگ، نور، خوشبو، ولولہ، عقل، دل، عمل اور منزل، یہ سب جو کچھ ہے جس کا نام ندوہ ہے۔

ہاں تو بات اس رات کی ہے!

[illegible]

ہاں تو بات اس رات کی ہے۔ ۔۔۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی

یہ رات کوئی نئی تو نہیں، ماسٹر مسیح صاحب کی آنکھوں کی پرانی تصویروں سے جانے کتنی ہی راتیں گذری ہوں گی بالکل ایسی یا اس جیسی۔

میری آواز کہہ رہی تھی، سال کے اس آخری انعامی جلسے میں دل چاہتا ہے سب کچھ کہہ دوں۔

دوستو! آپ نے کتنا پیار دیا، کتنی محبت، جذبات کا اظہار کیسے کروں، آخر یہ محبت کی کون سی منزل ہے جہاں جذبات اور الفاظ تک کی دوئی گوارہ نہیں ہوتی، صرف خموشی ہی گفتگو ہوتی ہے، کہیں خاموشی کا دوسرا نام یہی "فنا" تو نہیں۔

اب میرے الفاظ پابند تھے یا پابند رسوم، سننے والے سن رہے تھے۔

"اس سال بزم سلیمانی و بزم خطابت کے انعامی مقابلے توقع سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوئے۔ علیا، سفلی دونوں گروپس، جد و جہد کرنے والوں اور انعام یا دوسرے الفاظ میں منزل مقصود تک پہنچنے والوں کی تعداد ہمیشہ سے بڑھ کر رہی۔"

جیسے چپکے سے کسی نے کہہ دیا ہو،

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی"

ہاں تو آواز کا عمل جاری تھا۔ "انعامی مقابلوں کے عنوانات خالص ندوی مقاصد کے آئینہ دار تھے سنیئے، خطابت کے سینئر گروپ میں موضوع تھا "اسلام عالمی امن کا ضامن" جونیئر گروپ میں "اسلام اور پیام انسانیت" ۔۔۔ بزم سلیمانی کے سینئر گروپ میں زیر بحث عنوان تھا "اشتراکیت دور حاضر کا خطرناک فتنہ" اور سفلی میں "تحریک ندوۃ العلماء جائزہ اور توقعات"۔ اسلام، عالمی امن، اشتراکیت، پیام انسانیت اور پھر خود کا محاسبہ، عطار کی فکر، ادیبوں کا اسلوب!

مولانا عبد الماجد دریابادی کے الفاظ غنچوں پر شبنم کی سی کیفیت کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے قوس قزح کا رنگ پیش کرنے میں پورے صادق پورے مخلص ثابت ہو رہے تھے۔

"زخم کے اندمال اور چوٹ کے التیام کا کام ندوہ ہی کی قسم کی جماعت انجام دے سکتی ہے جو روح اور مغز کے لحاظ سے قدیم ہو اور شکل و قالب کے لحاظ سے جدید، صراحی اور گلاس نئے ہوں اور ان کا مشروب وہی جانا پہچانا ہوا پرانا۔"

اسلام، عالمی امن، سرمایہ داری، اشتراکیت، تحریک ندوۃ العلماء،

اس رات جیسے جام سے جام، صراحی سے گلاس ٹکرا گئے تھے۔ ساقی، پیمانہ، خم، پیر مغاں اور پھر،

نگاہوں میں ایک مخصوص چمک، پر خلوص تبسم جیسے سوتے میں کوئی خوبصورت سا خواب دیکھ لیا ہو۔

سیرابی، سیرابی اور سیرابی۔

ہاں بات اس رات کی ہے، میری آواز جیسے سیاہی کے سامنے پردوں کو چاک کر کے دور بہت دور سحر منتظر کو بشارت دے رہی تھی۔

ان انعامی مقابلوں میں جو منزل مقصود تک جلد پہونچ گئے وہ ہیں بزم خطابت کے سینئر اور جونیئر گروپ میں بالترتیب نظام الدین، عبد القدیر، سید سعید حسن اور نعیم اختر، نور الہدیٰ، محمد ظفر اول دوم سوم اور بزم سلیمانی کے علیا و سفلی میں اسی ترتیب کے ساتھ اول دوم سوم محمد حسن، عبد القدیر، شکیل اعظمی اور سید مسعود الحسن، ابراہیم مجتبیٰ اور شعیب اعظمی۔

اور پھر ایک نیا چونکا دینے والا انعام، سال بھر ہفتہ واری جلسوں میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے کیلئے ترغیبی انعام، انعام پانے والے سید سجاد علی اور شکیل اعظمی۔

اور اب انعامات کی نوعیت کا ذکر ہو رہا تھا، جدت کے ساتھ جدت اور لذت کتنا ربط ہے دونوں میں، جدت اور حسن، جدت اور دلکشی، چاند تاروں کی یہ گردش، رات اور دن کی آمد و رفت، خزاں بہار اور پھر خزاں اور پھر بہار، موت، زندگی، موت اور پھر زندگی، سب جدت، تجدید، تجدد۔

ہاں تو بات اس رات کی تھی!

سیرت النبی سٹ، شبلی سٹ، سلیمان سٹ، عبد الماجد سٹ، حسنی سٹ، منظور نعمانی سٹ، تاریخ اسلام سٹ، جامعہ معیاری کتب سٹ، شعر العجم سٹ، رشید احمد صدیقی سٹ، تفسیر ماجدی، سیرۃ النبی سے لے کر فسانۂ آزاد، گنجائے گرانمایہ اور پھر شمس الرحمن فاروقی کی سبز در سبز تک انعاموں کا یہ مجموعہ سات کیا دسیوں رنگ کی قوس قزح کا نمونہ پیش کر رہا ہے، قدیم، جدید، جدید، قدیم، نافع، مفید، جام، صراحی سب حرکت میں تھے سب کا محور اب کا مدار ندوہ ندوہ ندوہ

اور تالیوں کی گونج ان مکتبوں، اداروں اور افراد کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی جنہوں نے زندگی کے جہاد میں گھس جانے ان نوخیز نوجوان مجاہدوں کی تیاری میں امداد پہونچائی تھی ۔۔۔ تحقیقات و نشریات اسلام، مکتبہ فردوس، مکتبہ اسلام، ندوہ بک ڈپو، مشرق بک ایجنسی، دانش محل، نسیم بکڈپو، خورشید بکڈپو، البعث الاسلامی، تعمیر حیات، اسحاق جلیس ندوی، مولانا عارف سنبھلی، عبد المغنی فیض، احسان شناسی، محسن شناسی کامیابی کی بڑی چیز ہے، لئن شکرتم لازیدنکم کلید فوز و فلاح یہی تو ہے۔

اور اب سحر قریب تھی، تاریکی ہمیشہ رو سیاہ ہی نہیں رو پوش ہوتی ہے، پو پھٹ رہی تھی، نئے افق پھر ابھر رہے تھے، روشن ہو رہے تھے، روشنی کا سفر شروع ہو رہا تھا۔

دونوں بزموں کے معتمد حضرات نظام الدین رانچوی اور سید محمد حسن، نئی امنگوں کے ساتھ مستقبل کی بزموں کو سنوارنے کے لئے تیار ہو چکے تھے،

اور یہی میری آواز تو وہ نئی انجمنوں کی تلاش میں نکل چکی تھی۔

ہاں تو وہ رات کبھی نہ بھولے گی۔

ایک مثالی مدرسہ

تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی اور مذہبی مدرسہ نہیں جو بلحاظ جامعیت و وسعت و عظمت کے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، یعنی جس میں تمام علوم دینیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول فقہ کی تعلیم ایسے کمال درجہ تک دی جاتی ہو کہ تحقیق کا مرتبہ حاصل ہو سکے جس میں اسلامی علوم کی تمام قدیم اور نادر کتابیں فراہم کی گئی ہوں، جس میں طالبعلموں کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہو، جس میں ایسے لوگ تیار کئے جاتے ہوں جو مخالفین کے اعتراضات کا جواب آج کے مذاق کے موافق دے سکیں، جس میں حکومت کی موجودہ زبان بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو جس کی عمارت وسیع پُر فضا اور عظیم الشان ہو۔

اس غرض کو پورا کرنے کے لئے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا دار العلوم قائم کیا گیا۔

(علامہ شبلی نعمانیؒ)